فارم ۱۷

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس، اعظم گڈھ

مقام اشاعت — دار المصنفین اعظم گڈھ

نوعیت اشاعت — ماہانہ

نام پرنٹر — صدیق احمد

قومیت — ہندوستانی

پتہ — دار المصنفین اعظم گڈھ

نام پبلشر — "

قومیت — ....

پتہ — دار المصنفین اعظم گڈھ

نام اڈیٹر — شاہ معین الدین احمد ندوی

قومیت — ہندوستانی

پتہ — دار المصنفین اعظم گڈھ

نام و پتہ مالک رسالہ — "

میں صدیق احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔

صدیق احمد

جلد ۹۱ - ماہ ذیقعدہ ۱۳۸۲ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۶۳ء - عدد ۴

مضامین

شذرات

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ پاکستان کے نامور فاضل مولوی محمد شفیع صاحب سابق پرنسپل اورنٹیل کالج لاہور نے انتقال کیا، ان کی وفات علمی دنیا کا بڑا حادثہ ہے، وہ ہند و پاک کے نامور فضلاء و محققین میں تھے، انگریزی کے ساتھ عربی و فارسی کے بھی ماہر تھے، ان کا علمی پایہ بہت بلند تھا، ان کے علمی و تحقیقی کارنامے بڑے متنوع ہیں، بہت سے فاضلانہ علمی مقالات کے علاوہ انھوں نے عربی و فارسی کی متعدد اہم اور نادر کتابوں کو تصحیح و تحشیہ کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا، اپنی پرنسپلی کے زمانہ میں علمی حیثیت سے اورنٹیل کالج میگزین کا معیار بہت بلند اور اپنے تلامذہ میں سنجیدہ علمی تلاش و تحقیق کا ایک عام ذوق پیدا کر دیا تھا، چنانچہ لاہور کے موجودہ فضلا اور محققین میں بیشتر انہی کے تربیت یافتہ ہیں، ادھر چند سال سے لاہور یونیورسٹی میں اردو انسائیکلوپیڈیا کی تالیف و اشاعت کا کام ان کی نگرانی میں شروع ہوا تھا، اور اس کے بعض اجزاء شائع بھی ہوئے، لیکن ابھی یہ کام ابتدائی منزل میں ہے، اس قحط الرجال کے زمانہ میں علمی ذوق و طلب میں ان کی ذات علمائے سلف کا نمونہ تھی، اللہ تعالیٰ اس شیدائے علم کو رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے۔

مولانا محمد علی مرحوم کی حیثیتیں اور ان کے کارنامے بڑے گوناگوں ہیں، وہ جنگ آزادی کے اُن سالاروں میں ہیں جنھوں نے ہندستان میں آزادی کی روح پھونکی، اس راہ میں انکی قربانیاں اور ان کے خالص وطنی و ملکی خدمات کانگریس کے کسی بڑے سے بڑے لیڈر سے کم نہیں ہیں، اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سب سے پہلے انھی نے کانگریس میں جان ڈالی تھی، مسلمانوں کے تو خاص قائد و رہنما تھے، ان کے زمانہ میں مسلمانوں کا کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جس میں ان کا نمایاں حصہ نہ رہا ہو بلکہ ہر معاملہ میں انھی کی شرکت سے جان پڑتی تھی، ۱۹۱۱ء یعنی کامریڈ کے اجراء سے لیکر اپنی وفات ۱۹۳۰ء کے آخر تک ان کی زندگی ایک جہد مسلسل تھی، اور تقریباً چوتھائی صدی تک وہ ہندوستان کی سیاست پر چھائے رہے، ان کے دور میں مسلمانوں میں سب سے زیادہ نمایاں شخصیت انھی کی تھی، لیکن یہ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ ہندوستان نے بہت جلد اپنے اس محسن اعظم کو بھلا دیا، اور ان کا نام بھی کسی موقع پر نہیں آنے پاتا، اس سے زیادہ افسوس مسلمانوں کی بے حسی پر ہے کہ وہ بھی اس "مرد مومن" کو بھولتے جاتے ہیں۔

ان حالات میں یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ لاہور میں "محمد علی اکیڈمی" کے نام سے ایک ادارہ قائم ہو رہا ہے، مولانا محمد علی مرحوم پر ابھی بہت کم کام ہوا ہے، انکی وفات کے بعد مولوی رئیس احمد صاحب جعفری نے انکی ایک مختصر سوانح لکھی تھی، جو اسی زمانہ میں جامعہ ملیہ سے شائع ہوئی تھی، اگرچہ وہ مصنف کی تصنیفی زندگی کا ابتدائی دور تھا، اس لیے ناقص تھی، لیکن کچھ نہ ہونے کے مقابلہ میں غنیمت تھی، اس کے بعد محمد سرور صاحب نے مولانا مرحوم کے قلم کے ہمدردی کے مضامین کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا، جو ۱۹۳۸ء میں جامعہ ہی سے شائع ہوا تھا، ابھی گذشتہ سال انھوں نے ایک کتاب "مولانا محمد علی بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز" لکھی ہے جو لاہور سے شائع ہوئی ہے، اس میں خود مولانا محمد علی مرحوم کی تحریروں اور مضامین کی روشنی میں انکی شخصیت اور ان کے کارناموں کو دکھایا گیا ہے، اس لیے اسکی حیثیت گویا خود نوشت سوانح کی ہے، اور اس حیثیت سے وہ بڑی قابل قدر ہے[۱]، لیکن مولانا محمد علی مرحوم کی شخصیت اتنی جلیل القدر اور ان کے کارنامے اتنے گوناگوں ہیں کہ ان چند کتابوں سے ان کا حق ادا نہیں ہوتا، اور ان پر مستقل کام کرنے کی ضرورت ہے، توقع ہے کہ یہ اکیڈمی اس فرض کو پوری طرح انجام دیگی، اور مولانا محمد علی مرحوم کے حب علم و قلم قدر داں اور متوسلین اس کام میں مدد کریں گے۔

یورپ اور امریکہ کے ایک طبقہ میں اب مذہب اور روحانیت کا احساس پیدا ہو چلا ہے، اس کے

[۱] اس سلسلہ کی سب سے اہم کتاب مولانا عبدالماجد صاحب مدظلہ کی "محمد علی" جو شذرات لکھتے وقت ذہن سے اتر گئی تھی۔

دو سبب ہیں، ایک سبب تو یہ ہے کہ مغربی قوموں کے مادی تصور حیات اور انکی مادی تہذیب کی پیدا کردہ بےچینی و بے اطمینانی، بے قید آزادی کے تلخ نتائج، قومی سربلندی اور سیاسی برتری کے جنون نے قوموں میں ایسی رقابت اور کشمکش پیدا کر دی ہے جس نے ان کو نہ صرف قلبی سکون اور روحانی طمانیت بلکہ دنیاوی امن و سکون سے بھی محروم کر دیا ہے، اس لیے اب انکی زبانوں پر مذہب و روحانیت کا نام آنے لگا ہے،

دوسرا سبب یہ ہے کہ کمیونزم سیاسی قوت اور مادی ترقی کے ہر میدان میں اتنا آگے بڑھ گئی ہے کہ مغربی قوموں کے لیے خطرہ بن گئی ہے، گو انکی تہذیب بھی خالص مادی ہے، لیکن اس کی بنیاد الحاد و بے دینی پر نہیں ہے، اور انکے یہاں کم از کم خدا اور مذہب کا نام اور اس کا کچھ نہ کچھ اثر باقی ہے، اس کے مقابلہ میں کمیونزم کی بنیاد تمامتر مادہ پرستی، ناخدا شناسی اور الحاد و دہریت پر ہے، اس لیے اس کے مقابلہ کے لیے مادی وسائل کے ساتھ مذہب کے نام پر بھی اپیل کیجا رہی ہے، اور مختلف مذہبی تدبیریں اختیار کی جا رہی ہیں، لیکن ان . . . امراض کا یہ علاج نہیں ہے، یہ ساری خرابیاں، مادی تصور حیات اور مادی تہذیب کی پیدا کردہ ہیں، جب تک اس تصور میں تبدیلی نہ ہوگی اور عمل میں اس کا ثمر ظاہر نہ ہوگا، اس وقت تک محض مذہب کے نام اور اخلاقی وعظ سے کوئی روحانی و اخلاقی انقلاب نہیں پیدا ہو سکتا، اور مغربی قومیں مادی تہذیب میں اسقدر غرق ہیں کہ کسی آسمانی تنبیہ کے بغیر اس سے ان کا نکلنا بہت مشکل ہے، اور یہ تنبیہ ایٹمی جنگ کی شکل میں ہوگی، اس کے بعد جو نسل باقی رہ جائیگی اس میں شاید مذہب اور روحانیت کا حقیقی احساس پیدا ہو،

گذشتہ مارچ ۱۹۶۳ء کو ہمارے رفیق کار سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب نے دلی یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں "ہندستان کے فارسی لٹریچر میں حب وطن" کے عنوان سے انگریزی میں ایک توسیعی لکچر دیا جو بہت پسند کیا گیا، اس قسم کے لکچر علمی حیثیت کے علاوہ ثقافتی تعلقات کے نقطۂ نظر سے بھی مفید ہیں۔

مقالات

اسلامی ہند کے نصف اوّل میں علوم عقلیہ کا رواج

از جناب شبیر احمد خانصاحب غوری ایم اے، ایل ایل بی، رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی (اتر پردیش)

یہ مضمون گو مستقل ہے لیکن ایک حیثیت سے گذشتہ مضمون کی کڑی ہے، اس لیے اس کو اسی سلسلہ میں شائع کرنا مناسب معلوم ہوا، "م"

(۱) نویں صدی سے پہلے معقولات کی گرم بازاری

ہندوستان میں قرونِ وسطیٰ کا آغاز ساتویں صدی عیسوی سے ہوتا ہے، جب کہ عرب فاتحین اس ملک میں پہلی مرتبہ داخل ہوئے، اور خاتمہ ۱۸۵۷ء میں سمجھنا چاہیے، جب کہ برطانوی استعمار نے مغل سلطنت کے کھنڈروں پر انگریزی حکومت قائم کی، اس طویل مدت کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے:-

۱۔ عرب حکومت: ۱۵ھ سے ۴۱۷ھ تک

۲۔ ترک و افغان حکومت: ۳۶۷ھ سے ۹۳۲ھ تک

۳۔ مغل حکومت: ۱۵۲۶ء سے ۱۸۵۷ء تک

ذیل میں صرف پہلے دو دوروں کی علمی سرگرمیوں کا ایک مختصر تذکرہ پیش کیا جا رہا ہے:

(۱) عرب حکومت

عرب حکومت کو تین ذیلی ادوار میں مزید تقسیم کیا جا سکتا ہے

ا۔ عرب فاتحین کی آمد اور سرحدی جھڑپیں ۱۵ھ۔ ۹۳ھ

حسب تصریح البلاذری ۱۵ھ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عثمان بن ابی العاص کو بحرین اور عمان کا گورنر بنا کر بھیجا، انھوں نے عمان پہنچکر ایک بحری مہم بمبئی کے قدیم بندرگاہ تھانہ کی طرف روانہ کی، کچھ دن بعد ایک اور مہم بھڑوچ اور دوسری دیبل کی طرف بھیجی گئی، یہ سب مہمیں کامیاب لوٹیں، لیکن حضرت عمرؓ دور دراز علاقوں کی فتوحات کو پسند نہیں فرماتے تھے، اس لیے کچھ عرصہ کے لیے سمندر کی جانب سے ہندوستان پر حملہ کا خیال ختم ہوگیا[1]

مگر اسی عرصہ میں ایران کی عظیم الشان سلطنت عربوں کے قبضہ میں آگئی، اور قلمروے خلافت کی سرحدیں برصغیر کی شمالی مغربی حدود سے متصل ہوگئیں، اس طرح سرحدی جھڑپوں کا ہونا ناگزیر ہوگیا، چنانچہ ۴۴ھ میں مہلب بن ابی صفرہ بلوچستان فتح کرتے ہوئے لاہور اور بنوں تک پہنچ گئے،[2]

اس کے بعد بھی سرحدی آویزشوں کا سلسلہ باقی رہا، مگر ان کی نوعیت ہنگامی یورشوں کی سی تھی، کیونکہ اموی خلفاء بھی دور دراز علاقوں پر قبضہ کرکے قلمروے خلافت میں شامل کرنا نہیں چاہتے تھے، یہ صورت حال ۹۳ھ تک باقی رہی،

اس وقت تک تو عربوں کو ہندوستان میں قدم جمانے کا موقع ملا تھا، اور نہ وہ خود علوم حکمیہ سے واقف ہوئے تھے، اس لیے اس ذیلی دور میں کسی علمی کاوش کی تلاش بیکار ہے، اگرچہ سندھ کے جو لوگ موالی کے زمرے میں قلمروئے خلافت پہنچے انکی اولاد جلد ہی علم و فضل کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکنے لگی، ان میں سب سے اہم عمرو بن عبید ہے، جس کا دادا سندی الاصل تھا، اور کابل کے جنگی قیدیوں کے زمرے میں عراق پہنچا تھا، مسعودی لکھتا ہے :-

وھو عمرو بن عبید بن رباب	وہ عمرو بن عبید بن رباب ہے جو بنی تمیم کا
مولی بنی تمیم وکان جدہ	مولیٰ تھا، اس کا دادا باب سندی لوگوں

[1] فتوح البلدان ص ۴۳۸ [2] ایضاً ص ۴۳۸ - ۴۳۹

رباب من سبی کابل من رجال	میں سے تھا اور کابل کے جنگی قیدیوں میں
السند۔ وکان شیخ المعتزلۃ و	آیا تھا، عمرو بن عبید معتزلہ کا پیشوا اور
مفتیھا ولہ خطب ورسائل[1]	مفتی تھا، اس نے بہت سے خطبے اور رسالے لکھے تھے۔

عمرو بن عبید معتزلی علم کلام کے بانی واصل بن عطا کا دست راست اور معتزلہ کے فرقہ عمریہ کا بانی تھا،[2] اس طرح علم کلام کی بنیاد ایک سندی الاصل فاضل کی رہین منت ہے،

ب۔ عرب نوآبادی (۹۳ھ۔ ۲۴۰ھ)

امیر معاویہؓ کی وفات کے بعد عرب و ہند کے درمیان ایک اعصابی جنگ چل پڑی جس نے ۹۳ھ میں ایک فیصلہ کن لڑائی کی شکل اختیار کرلی، ہوا یہ کہ دیبل کے میدوں نے ایک جہاز کو لوٹ لیا، جس میں کچھ عرب خواتین بھی سوار تھیں، حجاج نے سندھ کے حکمراں راجہ داہر سے قیدی خواتین کی واپسی کی درخواست کی، مگر راجہ نے ایک ٹالنے والا جواب دیا،[3] مجبور ہوکر اس نے خلیفہ سے لڑائی کی اجازت لی، اور اپنے بھتیجے محمد بن قاسم کی قیادت میں ایک لشکر روانہ کیا، جس نے ۹۳ھ میں سندھ کو اور دو سال بعد ملتان کو فتح کرلیا، مگر اتنے میں خلیفہ ولید بن عبد الملک کا انتقال ہوگیا اور نئے خلیفہ نے محمد بن قاسم کو معزول کردیا، اس کے جانشین زیادہ قابل نہ تھے، اس طرح عربوں کی فتوحات کا سلسلہ رک گیا، البتہ برصغیر کا شمالی مغربی حصہ ان کے قبضہ میں آگیا،

۱۱۱ھ تک سندھ اور ملتان کا ایک ہی والی ہوتا تھا، اس کے بعد ملتان کا علاقہ سندھ کی بالادستی سے علحدہ ہوگیا، جہاں ۳۷۰ھ تک بنو منبہ کی حکومت رہی،

۱۳۲ھ میں اموی خلافت کے زوال پر عباسی خلافت قائم ہوئی اور سندھ بھی نئی خلافت کا ایک صوبہ بن گیا، مگر کچھ عرصہ بعد یہاں کے عرب خاندانوں میں قبائلی عصبیت نے خانہ جنگی کی شکل

[1] مروج الذہب برحاشیہ کامل ابن اثیر جلد ثامن ص ۹۰ [2] الفرق بین الفرق [3] فتوح البلدان ص ۴۴۱

اختیار کرلی، جو گورنر بھیجا گیا ناکام ہوا، آخر متوکل نے ایک مقامی امیر عمر بن عبدالعزیز الہباری کو ۲۴۰ھ میں سندھ کا نیم مختار حاکم تسلیم کرلیا،

عرب اپنے ساتھ اپنا دین اور کلچر بھی لائے تھے، اور ملک نے بڑی تیزی سے نئے ثقافتی رنگ کو قبول کیا، چنانچہ جن لوگوں نے اسلامی علوم کی ترقی میں حصہ لیا ہے ان کی صف اول میں سندھیوں کا نام نمایاں نظر آتا ہے، جیسے حدیث میں ابو معشر نجیح، فقہ میں امام اوزاعی[1]، کلام میں عمرو بن عبید[2]، شاعری میں ابو عطاء السندی،

لیکن سرزمین ہند کے یہ ستارے باہر ہی جاکر چمکے اور سندھ کے اندر نو وارد فضلا ہی کا تذکرہ ملتا ہے، جیسے قاضی موسیٰ بن یعقوب الثقفی جنھیں محمد بن قاسم نے قاضی القضاۃ مقرر کیا تھا، دوسرا نام ربیع ابن صبیح کا ہے جو بعض علماء کے نزدیک عربی ادب کے پہلے مصنف ہیں، وہ بھی سندھ ہی میں دفن ہیں[3]،

جہاں تک فلسفہ و حکمت کا تعلق ہے، ابھی بغداد میں اس کی تشکیل ہو رہی تھی، اور اس کے لیے یونان اور دیگر قدیم ممالک کے علمی سرمایہ کو عربی میں منتقل کیا جارہا تھا، اس میں ہندوستان کے حکمی ادب کا بھی خاص حصہ ہے،

چنانچہ ۱۵۶ھ (یا بقول البیرونی ۱۵۴ھ[4]) میں ہندوستان کا ایک علمی وفد منصور کے دربار میں پہنچا، اور دیگر علمی تحائف کے ساتھ "برہم سدھانت" کا ایک نسخہ بھی اسکی خدمت میں پیش کیا، منصور نے منجمین دربار میں سے محمد بن ابراہیم الفزاری اور یعقوب بن طارق کو اسے عربی میں منتقل کرنے کا حکم دیا[5]، اسی ترجمہ پر جو عرصہ تک "السند ہند" کے نام سے موسوم رہا، عرب علم الہیئۃ کی بنیاد رکھی گئی، مامون الرشید کے عہد میں محمد بن موسیٰ الخوارزمی نے "المجسطی" اور "زیج شہریار"

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص ۱۷۱ [2] مروج الذہب برحاشیہ کامل ابن الاثیر جلد ثامن ص ۹۰
[3] سبحۃ المرجان [4] کتاب الہند ص ۲۰۸ [5] طبقات الامم قاضی صاعد اندلسی ص ۸،

کی مدد سے اس پر نظر ثانی کرکے اپنی "زیج الخوارزمی" مرتب کی، جو عرصہ تک مسلم ہیئت دانوں کا معمول بہ رہی، خوارزمی کے علاوہ اور ہیئت دانوں نے بھی السند ہند کے ساتھ اعتنا کیا، جیسے حبش الحاسب، عبداللہ بن اماجور، حسن بن المصباح، حسین بن محمد الآدمی، فضل بن حاتم التبریزی، محمد بن اسحاق السرخسی، البیرونی، ابن السمح، ابن الصفار وغیرہ[1]،

اس کے ساتھ ہندوستانی علم الحساب (حساب الہند) بھی عربوں میں پہنچا اور اس کے ضمن میں مسلمان ریاضی داں "طریق ترقیم اعداد (الارقام الہندیہ) سے واقف ہوئے جو بعد میں یورپ پہنچکر ("Arab Numerals" کے نام سے موسوم ہوا،

اسی طرح ہندوستانی اطبا نے جاکر دار الخلافہ میں ہندوستانی طب کا نام بلند کیا، منکہ نے ہارون الرشید کے لاعلاج مرض کو اچھا کیا[2]، اور صالح بن بہلہ نے اس کے چچا زاد بھائی ابراہیم کو جو بظاہر مرچکا تھا، تندرست کیا[3]، منکہ اور ابن دھن نے آیور وید کی بہت سی کتابوں کے عربی میں ترجمے کیے، جن کی تفصیل ابن الندیم نے الفہرست میں دی ہے[4]، مسلمان اطبا نے ان تراجم سے بہت زیادہ استفادہ کیا، چنانچہ علی بن ابن الطبری جس نے متوکل کے عہد میں اپنی مشہور کتاب "فردوس الحکمۃ" کو لکھا تھا، اس کے آخری باب میں ہندو طب کا خلاصہ بیان کرتا ہے، اسی طرح اس کے شاگرد ابوبکر زکریا الرازی نے بقول ابن ابی اصیبعہ "کتاب الحاوی" میں اکثر ہندوستانی اطبا کی تصانیف سے استفادہ کیا ہے[5]،

ہندوستانی فلسفہ نے بھی علم کلام اور نام نہاد اسلامی فلسفہ کو متاثر کیا، "افادۂ نظر کا انکار" (Empiricism) (بدھ مفکرین) سے اسلامی فکر میں پہنچا[6]، "جزء لایتجزیٰ"

[1] اخبار العلماء باخبار الحکماء لابن القفطی ص ۱۷۸ [2] عیون الانباء فی طبقات الاطباء لابن ابی اصیبعہ جلد ثانی ص ۳۳
[3] ایضاً ص ۳۴-۳۵ [4] الفہرست لابن الندیم ص ۴۲۱ [5] ابن ابی اصیبعہ جلد ثانی ص ۳۲ [6] شرح المواقف

کا تصور جس کے انکار پر ابن سینا نے طبعیات کی بنیاد قائم کی، بودھ اور جینی فلاسفہ ہی سے ماخوذ ہے،[1] اور ہندوستانی علم و حکمت کے جس سرمایہ سے استفادہ کیا، اس کے لیے وہ اسی خطۂ ملک کے رہین منت تھے، جہاں ان کی حکومت تھی، اور جو "اسلامی ہند" کا مصداق تھا،

ج۔ ہندوستان کی نیم آزاد عرب حکومت ۲۴۰-۴۱۷ھ

۲۴۰ھ میں متوکل نے عمر بن عبد العزیز الہباری کو سندھ کا نیم خود مختار حاکم تسلیم کیا تھا، اس کے بعد ۲۷۰ھ میں اس کا بیٹا عبد اللہ بن عمر تخت نشین ہوا، جس نے تقریباً تیس سال حکومت کی، اس کے زمانہ میں بقول بزرگ بن شہریار سندھی زبان کے اندر اسلامی تعلیمات پر سب سے پہلے کتاب لکھی گئی،[2] اور اس طرح اردو زبان کی نیز عقائد اسلام کی سب سے پہلی تصنیف ظہور میں آئی، عبد اللہ بن عمر کا جانشین عمر بن عبد اللہ الہباری ہوا، جو بڑا قابل اور مدبر تھا، مگر اس کے بعد یہ خاندان کمزور ہوتا گیا، اور اکثر علاقے حکومت سے نکل گئے، پھر بھی ۳۷۵ھ کے بعد تک سندھ میں ہباریوں کی حکومت رہی، کیونکہ مقدسی نے اس سال یہاں انھیں کو حکمراں پایا تھا، غالباً چوتھی صدی کے آخر میں یہاں اسماعیلی قابض ہو گئے جن کے آخری حکمراں خفیف کو محمود نے ۴۱۷ھ میں ختم کر کے سندھ کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا،

ملتان میں بنو سامہ کی حکومت تقریباً ۳۷۲ھ تک رہی، کیونکہ ابن حوقل جو ۳۶۷ھ میں ملتان آیا تھا، یہاں سنی حکومت ہی کا ذکر کرتا ہے، مگر جب مقدسی ۳۷۵ھ میں یہاں آیا، تو مملکتی مذہب شیعیت کو پایا، نیز عضد الدولہ بویہی کی وفات پر مشرق میں اسماعیلی پروپگنڈا بڑھ گیا تھا،[3] اس کے نتیجہ میں جلم بن شیبان نے ملتان میں قرمطی (اسماعیلی) حکومت قائم کی جسے ۴۰۱ھ میں محمود غزنوی نے ختم کیا، مگر قرمطیت یہاں سے دور نہ ہو سکی، تفصیل آگے آ رہی ہے،

اس طرح عربوں کے زیر اثر حکومت ہندوستان میں اسلامی ثقافت کے دو گہوارے تھے،

---

[1] مذہب الذرہ عند المسلمین [2] عجائب الہند بزرگ بن شہریار ص ۳ [3] الفرق بین الفرق ص ۲۷۶

ایک سندھ میں اور دوسری ملتان میں، ابن حوقل ملتان کے بارے میں جہاں وہ ۳۶۷ھ میں آیا تھا، لکھتا ہے:-

وفی اھلھا رغبة فی القرآن وعلمه والاخذ بالقراءة لسبعة والفقه وطلبة الادب العلم[1]	ملتان کے باشندوں کو قرآن اور تفسیر نیز قرأت سبعہ اور فقہ سے رغبت ہے، اور ادب اور علم کا شوق ہے،

اسی طرح مقدسی جو سندھ میں ۳۷۵ھ میں آیا تھا، یہاں کی علمی حالت کے بارے میں لکھتا ہے،

المنصورة ھی قصبة السند ..... لھم مروّة وللاسلام عندھم طراوة والعلم واھله کثیر-[2]	منصورہ سندھ کا دار الحکومت ہے، یہاں کے باشندوں میں مروت ہے، اور اسلام کے لیے تر و تازگی ہے، یہاں علم اور علماء کی کثرت ہے،

سندھ میں عام طور پر علم حدیث کا بہت زیادہ چرچا تھا، مشاہیر علماء میں مقدسی قاضی ابو محمد منصوری کا ذکر کرتا ہے، جو داؤدی المذہب تھے، اور خود درس حدیث دیتے تھے،

اکثرھم اھل الحدیث ورأیت القاضی ابا محمد المنصوری داؤدیا اماما فی مذھبه وله تدریس وتصانیف قد صنف کتبا حسنة-[3]	یہاں کے اکثر باشندے اہل حدیث ہیں، میں نے یہاں قاضی ابو محمد منصوری کو دیکھا جو اپنے داؤدی مذہب کے امام ہیں، وہ درس دیتے ہیں اور ان کا ذاتی مدرسہ بھی ہے، اور تصنیف و تالیف میں بھی مشغول رہتے ہیں، بہت سی عمدہ کتابیں انھوں نے تصنیف کی ہیں۔

سندھ کے شہروں میں دیبل اور منصورہ بہت زیادہ مردم خیز تھے، دیبل (دیبل) ایک

---

[1] صورة الارض لابن حوقل ص ۳۲۲ [2] احسن التقاسیم للمقدسی ص ۴۷۹ [3] ایضاً ص ۴۸۱

کا تصور جس کے انکار پر ابن سینا نے طبعیات کی بنیاد قائم کی، بودھ اور جینی فلاسفہ ہی سے ماخوذ ہے[1]،
اور ہندوستانی علم و حکمت کے جس سرمایہ سے استفادہ کیا، اس کے لیے وہ اسی خطۂ ملک کے
رہین منت تھے، جہاں ان کی حکومت تھی، اور جو "اسلامی ہند" کا مصداق تھا،

ج۔ ہندوستان کی نیم آزاد عرب حکومت ۲۴۰-۴۱۷ھ

۲۴۰ھ میں متوکل نے عمر بن عبد العزیز الہباری کو سندھ کا نیم خود مختار
حاکم تسلیم کیا تھا، اس کے بعد ۲۷۰ھ میں اس کا بیٹا عبد اللہ بن عمر
تخت نشین ہوا جس نے تقریباً تیس سال حکومت کی، اس کے زمانہ میں بقول بزرگ بن شہریار سندھی
زبان کے اندر اسلامی تعلیمات پر سب سے پہلے کتاب لکھی گئی[2]، اور اس طرح اردو زبان کی نیز عقائد
اسلام کی سب سے پہلی تصنیف ظہور میں آئی، عبد اللہ بن عمر کا جانشین عمر بن عبد اللہ الہباری ہوا، جو
بڑا قابل اور مدبر تھا، مگر اس کے بعد یہ خاندان کمزور ہوتا گیا، اور اکثر علاقے حکومت سے نکل گئے، پھر بھی
۳۷۵ھ کے بعد تک سندھ میں ہباریوں کی حکومت رہی، کیونکہ مقدسی نے اس سال یہاں انھیں کو
حکمراں پایا تھا، غالباً چوتھی صدی کے آخر میں یہاں اسماعیلی قابض ہو گئے جن کے آخری حکمراں
خفیف کو محمود نے ۴۱۷ھ میں ختم کر کے سندھ کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا،

ملتان میں بنو سامہ کی حکومت تقریباً ۳۷۲ھ تک رہی، کیونکہ ابن حوقل جو ۳۶۷ھ
میں ملتان آیا تھا، یہاں سنی حکومت ہی کا ذکر کرتا ہے، مگر جب مقدسی ۳۷۵ھ میں یہاں آیا،
تو مملکتی مذہب شیعیت کو پایا، نیز عضد الدولہ بویہی کی وفات پر مشرق میں اسماعیلی پروپگنڈا بڑھ گیا،
تھا، اسی کے نتیجہ میں حلم بن شیبان نے ملتان میں قرمطی (اسماعیلی) حکومت قائم کی جسے ۴۰۰ھ
میں محمود غزنوی نے ختم کیا، مگر قرمطیت یہاں سے دور نہ ہو سکی تفصیل آگے آرہی ہے،

اس طرح عربوں کے زیر اثر حکومت ہندوستان میں اسلامی ثقافت کے دو گہوارے تھے،

[1] مذہب الذرہ عند المسلمین [2] عجائب الہند بزرگ بن شہریار ص ۳ [3] الفرق بین الفرق ص ۲۷۶

ایک سندھ میں اور دوسری ملتان میں، ابن حوقل ملتان کے بارے میں جہاں وہ ۳۶۷ھ میں
آیا تھا، لکھتا ہے:-

وفی اهلها رغبة فی القرآن وعلمه والاخذ بالمقاری لسبعة والفقه وطلبة الادب العلم[1]	ملتان کے باشندوں کو قرآن اور تفسیر نیز قرأت سبعہ اور فقہ سے رغبت ہے، اور ادب اور علم کا شوق ہے،

اسی طرح مقدسی جو سندھ میں ۳۷۵ھ میں آیا تھا، یہاں کی علمی حالت کے بارے میں لکھتا ہے:

المنصورة هی قصبة السند ..... لهم مروءة وللاسلام عندهم طراوة والعلم واهله كثير[2]	منصورہ سندھ کا دار الحکومت ہے، یہاں کے باشندوں میں مروت ہے، اور اسلام کے لیے تر و تازگی ہے، یہاں علم اور علماء کی کثرت ہے،

سندھ میں عام طور پر علم حدیث کا بہت زیادہ چرچا تھا، مشاہیر علماء میں مقدسی قاضی ابو محمد
منصوری کا ذکر کرتا ہے، جو داؤدی المذہب تھے، اور خود درس حدیث دیتے تھے،

اكثرهم اهل الحديث ورأيت القاضی ابا محمد المنصوری داؤديا اماما فی مذهبه وله تدريس وتصانيف قد صنف كتبا حسنة[3]	یہاں کے اکثر باشندے اہل حدیث ہیں، میں نے یہاں قاضی ابو محمد منصوری کو دیکھا جو اپنے داؤدی مذہب کے امام ہیں، وہ درس دیتے ہیں اور ان کا ذاتی مدرسہ بھی ہے، اور تصنیف و تالیف میں بھی مشغول رہتے ہیں، بہت سی اچھی کتابیں انھوں نے تصنیف کی ہیں،

سندھ کے شہروں میں دیبل اور منصورہ بہت زیادہ مردم خیز تھے، دیبل (دیبل) ایک

[1] صورۃ الارض لابن حوقل ص ۳۲۲ [2] احسن التقاسیم للمقدسی ص ۴۷۹ [3] ایضاً ص ۴۸۱

قدیم ساحلی شہر تھا جسے محمد بن قاسم نے ۹۳ھ میں فتح کیا تھا، یہاں کے علما میں سے مندرجہ ذیل حضرات کا تذکرہ تاریخ و تراجم کی کتابوں نے محفوظ رکھا ہے: ابو جعفر محمد بن ابراہیم الدیبلی، ابو العباس احمد بن عبد اللہ ابن سعید الدیبلی، ابراہیم بن محمد بن ابراہیم الدیبلی، ابو القاسم شعیب بن محمد بن احمد بن شعیب بن بزیع بن سوار (ابن قطعان) الدیبلی، علی بن موسی الدیبلی، خلف بن محمد الموازی الدیبلی، ابو العباس محمد بن محمد بن عبد اللہ الوراق الدیبلی

دوسرا مشہور شہر منصورہ تھا جس کی بنیاد محمد بن قاسم کے بیٹے عمر بن محمد بن قاسم نے ۱۲۰ھ کے قریب ڈالی تھی، مشاہیر اہل علم میں قاضی ابو محمد منصوری کے علاوہ اور بھی حضرات تھے، جیسے ابو محمد عبد اللہ ابن جعفر بن مرۃ المنصوری المقری وغیرہ،

لیکن سوائے قاضی ابو محمد منصوری کے ان بزرگوں نے سندھ سے باہر جا کر اپنی علمی سرگرمیاں کو جاری رکھا، خود سندھ کی ثقافتی رونق دار الخلافہ سے آئے ہوئے فضلا ہی کی رہین منت ہے، ان میں دو خاندان زیادہ مشہور رہیں، قاضی محمد بن ابی الشوارب کا خاندان اور دوسرا شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے اسلاف، موخر الذکر بعد کو ملتان میں منتقل ہو گیا تھا،

بظاہر سندھ میں وہ مذہبی بحران تھا جس کے ازالے کے لیے علم کلام کی ضرورت پڑتی (اگرچہ خفیہ طور پر اسماعیلی دعاۃ کی کوششوں سے فلسفہ و حکمت کی گرم بازاری ہو رہی تھی) پھر بھی علم کلام کی ترقی سے اس ملک کا نام وابستہ ہے، عمرو بن عبید جو معتزلی علم کلام کے قدیم موسسین میں سے ہے، بقول مسعودی سندی الاصل ہی تھا، بعد کے متکلمین میں سمعانی اور یاقوت نے ابو نصر الفتح بن عبد اللہ السندی کا ذکر کیا ہے۔[1] مگر عمرو بن عبید ہو یا ابو نصر فتح بن عبد اللہ باہر ہی جا کر چمکے، خود سندھ میں سوائے ان عراقی عالم کے جنھوں نے راجہ مہروک بن رائق کے لیے تعلیمات اسلام پر کتاب لکھی تھی، کسی متکلمانہ سرگرمیوں کا پتہ نہیں چلتا۔

۱؎ کتاب الانساب للسمعانی ورق ۳۱۴

لیکن جہاں تک علوم فلسفیہ کا تعلق ہے یہ باور کرنے کے وجوہ ہیں کہ سندھ اور بالخصوص ملتان میں خفیہ طور پر ان علوم کی بڑی تیزی سے اشاعت ہو رہی تھی، چوتھی صدی کی ابتداء سے اسماعیلی دعاۃ عالم اسلام میں انقلاب کے لیے زمین ہموار کرتے پھر رہے تھے، غالباً ہندوستان میں بھی وہ اسی زمانہ میں آئے، چنانچہ مسعودی کے بارے میں جو یہاں ۳۰۴ھ میں آیا تھا بعض لوگوں کا یہی خیال ہے، آل بویہ کے برسر اقتدار آنے پر ان کی دعوتی سرگرمیاں بہت بڑھ گئیں،[1] مگر معز الدولہ کے آخری عہد میں یہ کم ہو گئیں، اور عضد الدولہ کے زمانہ میں تو بہت ہی کم ہو گئیں،[2] لیکن اس کے مرنے پر عزیز باللہ فاطمی نے ان دعوتی سرگرمیوں کو از سر نو تیز کر دیا،[3] اس کے نتیجے میں ایک اسماعیلی داعی کے ۲۷۰ھ میں سندھ آنے کا تذکرہ ملتا ہے، جس کا نام ہیثم تھا، سندھ تو ابھی تیار نہ تھا، البتہ ملتان کی فضا انقلاب کے لیے ہموار ہو چکی تھی، لہذا عزیز باللہ نے حلم بن شیبان کو یہاں بھیجا، جس نے ملتان میں بنو سامہ کی سنی حکومت کو ختم کر کے اسماعیلی حکومت قائم کی، اسی نے ملتان کے قدیم بت کو توڑا اور اسماعیلی مذہب کی شدت سے تبلیغ کی، چنانچہ البیرونی کتاب الہند میں لکھتا ہے:۔

فلما استولت القرامطة	پس جب قرامطہ ملتان پر قابض ہو گئے
علی الملتان کسر جلم بن شیبان	تو جلم بن شیبان نے اس (قدیم)
المتغلب ذلک الصنم وقتل	بت کو توڑ ڈالا اور اس کے پجاریوں
سدنته[4]	کو قتل کر دیا

حلم کے بعد شیخ حمید تخت نشین ہوا، ادھر سامانی سلطنت کے کھنڈروں پر غزنوی سلطنت قائم ہو چکی تھی، (تفصیل آگے آرہی ہے) سامانی حکومت کے اختلال میں بڑا ہاتھ اسماعیلی دعاۃ کی سازشوں کا تھا، اس لیے سبکتگین کو خراسان میں ان کے خلاف بیخ کنی کی

۱؎ الفہرست لابن الندیم ص ۲۶۸ ۳؎ الفرق بین الفرق ص ۲۷۶ ۴؎ کتاب الہند للبیرونی ص ۵۶

کوشش کرنا پڑی، منہاج سراج نے لکھا ہے:

"در عہد او کارہائے بزرگ برآمد و مادہ فساد باطنیہ از خراسان قلع کرد۔"[1]

لہٰذا حزم و احتیاط کا تقاضا تھا کہ وہ مشرقی سرحد سے بھی غافل نہ ہو، یہاں قرامطہ اپنی دسیسہ کاریوں میں مشغول تھے، اسی لئے ۳۸۲ھ میں سبکتگین نے ملتان پر حملہ کیا، مگر شیخ حمید نے صلح کر لی، سبکتگین کے بعد اس کا جانشین محمود ہوا، اس کے عہد میں شیخ حمید کے پوتے داؤد نے الحاد و بیدینی [جو اسلام بیزاری اور فلسفہ نوازی کا نام تھا] کی نشر و اشاعت میں جد و جہد شروع کی، اس لیے محمود کو اس کے خلاف تادیبی کارروائی کرنا پڑی، چنانچہ ہمعصر مورخ عتبی لکھتا ہے:-

قد کان بلغ السلطان یمین الدولۃ	سلطان یمین الدولہ امین الملۃ (محمود غزنوی)
و امین الملۃ حال والی الملتان	کو ملتان کے والی ابو الفتوح داؤد کی
ابی الفتوح فی خبث نحلتہ و دخل	بدمذہبی، بددینی، بداعتقادی اور بدترین
دخلتہ و حسن اعتقادہ و قبح الحادہ و دعا	الحاد کی اطلاع پہنچی تھی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ
الی مثل رائہ اھل بلدہ فانف	رعایا کو بھی اس بددینی اور الحاد کی طرف
للدین... حتی افتتحھا عنوۃ....	دعوت دیتا ہے تو سلطان غیرت دینی سے
... والزمھم عشرین الف الف	مجبور ہوا، یہاں تک کہ اس نے ملتان کو بزور
درھم[2]	شمشیر فتح کیا اور یہاں کے لوگوں پر دو کروڑ
	درہم تاوان عائد کیا،

داؤد نے یہ صلح دب کر کی تھی، اس لیے خفیہ طور پر اپنی ملحدانہ سرگرمیوں میں مصروف رہا، مجبوراً ۴۰۱ھ میں محمود نے ملتان پر حملہ کر کے اسے تہس نہس کر ڈالا فرشتہ لکھتا ہے:-

[1] طبقات ناصری ص ۸ [2] تاریخ یمینی للعتبی ص ۲۱۱ - ۲۱۲

"و ہم دریں سال سلطان دیگربار از غزنین بملتان آمد و آنرا بجبر و قہر مفتوح ساختہ بسیارے از قرامطہ و ملاحدہ را کشت و بسیارے را دست و پا برید و داؤد بن نصر را زندہ بدست آوردہ ہمراہ خود بغزنین برد و در قلعۂ غور محبوس ساخت تا در آنجا بمرد۔"[1]

یہاں سے خاسر و خائب ہو کر اسماعیلیوں نے منصورہ و سندھ پر قبضہ کر لیا، ۴۱۶ھ میں جب محمود سومنات فتح کر کے جا رہا تھا تو منصورہ کے اسماعیلیوں کی شہ سے جاٹوں نے اسے بری طرح پریشان کیا، اس لیے اس نے اگلے سال منصورہ پر حملہ کر کے اسے تباہ و برباد کر دیا، ابن الاثیر ۴۱۶ھ کے واقعات میں لکھتا ہے:-

وقصد المنصورۃ و کان	سلطان محمود نے منصورہ پر فوجکشی کی
صاحبھا قد ارتد عن الاسلام	کیونکہ وہاں کا والی اسلام سے مرتد ہو گیا
..... فاحاط بہ و بمن	(قرمطی ہو گیا تھا) سلطان نے اسے اور
معہ فقتلوا اکثرھم.....	اس کی فوج کو گھیر لیا اور بہت سے لوگوں کو
فرحل الی غزنۃ[2]	قتل کیا، اس کے بعد غزنی کو روانہ ہوا،

غرض باطنی (اسماعیلی) دعاۃ نے سندھ اور ملتان میں اتنا شدید پروپگنڈا کیا کہ تین سو سال کی بنو منبہ کی اور ڈیڑھ سو سال کی ہباریوں کی حکومت کو اکھاڑ پھینکا، ظاہر ہے یہ محض بیرونی فوجی امداد کے سہارے ناممکن تھا، اس کے لیے اسماعیلیوں نے عرصہ تک مقامی آبادی میں اپنی مذہبی دعوت پھیلائی ہو گی، جنکی اکثریت مریدین کے درجہ کی رہی ہو گی، مگر ایک معتد بہ جماعت ترقی کر کے "داعی" کے درجہ تک پہنچی ہو گی، لیکن مریدین یا دعاۃ دونوں کی تعلیم و تربیت میں باطنیوں کے یہاں علوم فلسفیہ بنیادی حیثیت رکھتے تھے، کیونکہ باطنیت کا مقصد ہی

[1] تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۶۷ [2] کامل لابن الاثیر جلد تاسع ص ۱۱۱

اسلام کے بجائے فلاسفہ کی تعلیمات کی اشاعت تھا، اس کی تفصیل سابق میں مذکور ہو چکی ہے، [معارف فروری ۱۹۶۳ء ص ۱۰۷ - ۱۰۹) اور بقول مقریزی باطنی دعوت کی آخری منزل میں تو مطولات فلسفہ کے پڑھنے کے علاوہ یہ تعلیم بھی دیجاتی تھی کہ فلاسفہ انبیاء سے افضل ہیں (نعوذ باللہ)

احاله على ما تقرر فى كتب	داعی نو آموز کو ان باتوں پر آمادہ کرے
الفلاسفة من علم الطبيعيات	جو فلاسفہ کی کتابوں میں طبیعیات و
وما بعد الطبيعيات والعلم	الٰہیات و ما بعد الطبیعیات کے سلسلے میں
الالٰهى وغير ذالك من اقسام	ثابت ہیں، نیز علوم فلسفہ کی دوسری اقسام
العلوم الفلسفية وان الفلاسفة	میں، اور اس بات پر کہ فلاسفہ ہی
انبياء حكمة الخاصة[1]	حکمت خالصہ کے پیغمبر ہیں۔

یہ وہی الحاد و بیدینی ہے، جس کی طرف عتبی نے "فی خبث نحلته ودخل دخلته هن اعتقاده وقبح الحاده" کے الفاظ میں اور ابن الاثیر نے "قد ارتد عن الاسلام" سے اشارہ کیا ہے، بہر حال ان تبلیغی سرگرمیوں کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ اس تحریک کے سرگرم کارکن فلسفہ کے افاضل بنجائیں، جیسا کہ خراسان میں ابن سینا وغیرہ اسی اسماعیلیت میں توغل کی بنا پر فلسفہ و حکمت میں سرآمد روزگار بن گئے تھے، حافظ ابن تیمیہؒ نے خود شیخ بو علی سینا سے نقل کیا ہے :-

ان ابن سينا اخبر عن نفسه	ابن سینا نے اپنے متعلق خبر دی ہے کہ
ان اهل بيته اباه واخاه كانوا	اس کے گھر والے یعنی اس کا باپ اور بھائی
من هؤلاء الملاحدة وانه	انھیں بد دین ملاحدہ (قرامطہ اسماعیلیہ)

---

[1] خطط المقریزی جلد ثانی ص ۲۳۳

انما اشتغل بالفلسفة بسبب	سے تعلق رکھتے تھے اور یہ کہ وہ صرف
ذالك[1]	اسی وجہ سے فلسفہ میں مشغول ہوا۔

اس لیے یہ باور کرنے کے قوی وجوہ ہیں کہ ملتان و سندھ جہاں ایک عرصہ سے باطنی دعاۃ اپنے مخصوص مناہج فکر پر لوگوں کی تربیت کر رہے تھے، فلسفہ و حکمت کا بڑا گہوارہ ہوں گے اگرچہ تاریخ نے اس ترویج و اشاعت کی تفصیل محفوظ نہیں رکھی، جو بالکل فطری تھا، اس لیے کہ خفیہ انقلابی تحریکوں کی تفاصیل کہیں محفوظ نہیں رکھی جاتیں، صرف معاصرین کے مجمل حوالوں اور قرائن کی مدد سے ان کی تاریخی تفصیلات کی بازتشکیل کی جاتی ہے۔

غرض باطنی دعاۃ کی ایک صدی کی جدّ مسلسل نے اس عہد کے "اسلامی ہند" کے مزاج میں باطنیت کے ساتھ تفلسف کو بھی راسخ کر دیا تھا، کیونکہ یہ علاقہ نویں صدی تک معقولات کی تعلیم کا گڑھ بنا رہا، یہیں (ملتان) سے مولانا عبد اللہ تلمبنی اور عزیز اللہ ملتانی نے دہلی پہنچکر معقولات کی گرم بازاری کو مزید رونق دی۔

---

[1] الرد علی المنطقیین لابن تیمیہ ص ۱۴۳

تاریخ سندھ

اس میں سندھ کا جغرافیہ، مسلمانوں کے حملہ سے پیشتر کے مختصر اور اسلامی فتوحات، خلافت راشدہ کے زمانہ سے لیکر آٹھویں صدی ہجری تک سندھ جن جن حکومتوں کے ماتحت رہا ان کی پوری تاریخ اور ان تمام دوروں کے نظام حکومت، علمی و تمدنی حالات اور رفاہ عام کے جو کام انجام پائے ان سب کی پوری تفصیل ہے۔

قیمت :- ۶ ے

منیجر

آزاد بلگرامی

(تصحیح و استدراک)

از

از جناب عبدالرزاق صاحب قریشی انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی

معارف کے تین شماروں (جنوری تا مارچ ۱۹۶۲ء) میں ہم نے میر غلام علی آزاد بلگرامی کے حالات زندگی، جہاں تک ہماری دسترس میں تھے، پیش کرنے کی کوشش کی تھی، مضمون کی اشاعت کے بعد اس میں کچھ غلطیاں نظر آئیں اور کچھ نیا مواد ملا، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ غلطیوں کی تصحیح کر دی جائے اور جو نیا مواد ملا ہے وہ بھی پیش کر دیا جائے تاکہ مضمون کسی حد تک مکمل ہو جائے،

۱- ۱۱۶۸ھ/۱۷۵۴ء تک کے حالات زندگی تحریر کرنے کے بعد ہم نے لکھا تھا کہ اس کے بعد کی تفصیل ہمارے پاس نہیں، ممکن ہے کہ کہولت سن کی وجہ سے آزاد نے سیر و سیاحت کا سلسلہ ختم کر دیا ہو[1]، لیکن آزاد کی عربی مثنوی مظہر البرکات[2] کا جو نسخہ کتب خانۂ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ہے، اس کے آخر میں کسی نے آزاد کے کچھ حالات (عربی میں) لکھے ہیں، ان سے مندرجہ ذیل مزید معلومات حاصل ہوتی ہیں:-

---

[1] معارف۔ فروری ۱۹۶۲ء ص ۱۳۵ [2] مظہر البرکات پر مولوی فضل الرحمن صاحب ندوی (شعبۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کا ایک بسیط اور اچھا مضمون مجلۂ علوم اسلامیہ (علی گڑھ) جلد ۱ نمبر ۲ میں شائع ہوا ہے۔

آزاد ۱۴ ربیع الآخر ۱۱۸۶ھ (۱۶ جون ۱۷۷۲ء) کو قصبۂ پیر علی کے قصد سے، جو اورنگ آباد سے چار منزل کی مسافت پر واقع ہے، نکلے اور ۲۱ ربیع الآخر (۲۳ جون) کو وہاں پہنچے، کچھ دنوں قصبۂ پیر علی میں قیام کرنے کے بعد ۲ جمادی الثانیہ (۱۳ اگست) کو وہ حیدر آباد کیلئے روانہ ہوئے اور ۲۴ ماہ مذکور کو وہاں پہنچے، مرآۃ الجمال (جس کا ذکر ہم ان کی تصانیف کے سلسلہ میں کر آئے ہیں) یہیں تصنیف ہوئی، آزاد نے اس کی ایک مختصر سی شرح بھی لکھی، عربی کا تیسرا دیوان بھی انھوں نے یہیں مرتب کیا، دو سال اور چند روز کے قیام کے بعد وہ حیدر آباد سے ۱۰ رجب ۱۱۸۸ھ (۱۹ اگست ۱۷۷۴ء) کو نکلے اور آخر رجب میں اورنگ آباد پہنچے، ان کے پوتے سید امیر حیدر (بن سید نور الحسن) ان کے بلاوے پر بلگرام سے اورنگ آباد آئے، پوتے نے دادا پر زور ڈالا کہ وہ فارسی شعراء کے انداز پر ردیف وار دیوان (عربی) مرتب کر دیں، انھوں نے عزیز پوتے کی بات مان لی اور محرم ۱۱۹۰ھ (فروری ۱۷۷۶ء) میں اس کام کا آغاز کیا اور چند ہی مہینوں میں اس کو پورا کر لیا، اس دیوان میں چند غیر معروف قصائد بھی شامل ہیں، جن میں سے بعض دیوان کی ترتیب سے پہلے کے کہے ہوئے ہیں اور بعض بعد کے۔

یہ مردف دیوان آزاد کا چوتھا دیوان ہے، ۱۱۹۱ھ (۱۷۷۷ء) میں انھوں نے دیوان مستزاد ترتیب دیا، یہ ان کا پانچواں دیوان ہے، اس کا نام انھوں نے لانظیر رکھا، لانظیر سے اس کا سال تصنیف نکلتا ہے۔ ۱۱۹۲ھ/۱۷۷۸ء میں انھوں نے چھٹا دیوان مرتب کیا، اس میں ترجیع بند ہیں، آزاد سے پہلے عربی میں ترجیع بند نہیں ملتی، ۱۱۹۳ھ/۱۷۷۹ء میں انھوں نے ساتویں دیوان کی ترتیب شروع کی اور محرم ۱۱۹۴ھ/۱۷۸۰ء میں اسے پورا کیا، انھوں نے ساتوں دیوانوں کو السبعۃ السیارہ کا نام دیا، اسی سال انھوں نے مثنوی مظہر البرکات کا پہلا دفتر نظم کیا، اس بحر (خفیف) میں عربی میں ابتک کسی نے مثنوی نہیں لکھی تھی، اسی سال کے آخر میں (ذی الحجہ کے آخری عشرہ میں) آزاد اورنگ آباد سے نکلے اور ۱۴ محرم الحرام ۱۱۹۵ھ (۱۲ دسمبر ۱۷۸۰ء) کو حیدر آباد پہنچے

حیدرآباد کے دوران قیام میں انھوں نے مظہر البرکات کا تیسرا دفتر ثانی نظم کیا، ۲۲ رجمادی الاولیٰ (۱۰ راپریل) کو وہ حیدرآباد سے روانہ ہو کر ۸ رجمادی الثانیہ (۲۴ رمئی) کو اورنگ آباد لوٹے، اور مظہر البرکات کا تیسرا اور چوتھا دفتر نظم کیا، چوتھا دفتر شعبان میں پورا ہوا، آزاد اس مثنوی کو سات دفتروں میں مکمل کرنا چاہتے تھے لیکن چوتھے دفتر کے بعد انھوں نے اپنا ارادہ بدل دیا، مگر ان کے پوتے سید امیر حیدر نے ان سے اصرار کیا کہ وہ اپنے سابق ارادہ اور خواہش کے مطابق باقی تین دفتر بھی نظم کر دیں، چنانچہ انھوں نے ۱۱۹۶ھ/۱۷۸۱ء میں باقی تین دفتر بھی نظم کر دیے، اسی سال انھوں نے شفاء العلیل فی اصطلاحات کلام ابی الطیب المتنبی بھی تالیف کی،

۲- صمصام الدولہ شاہ نواز خاں کی مآثر الامرا کے سلسلہ میں ہم نے لکھا تھا کہ شاہ نواز خاں کی وفات کے بعد آزاد نے اسے مرتب و مکمل کیا[1]، انھوں نے نہ صرف مآثر الامرا کو مرتب و مکمل کیا، بلکہ شاہنواز خاں کی دوسری تین کتابوں (بہارستان سخن[2]، موائد الفوائد[3]، منشآت شاہ نواز خاں) پر بھی نظر ثانی کی، اس کے علاوہ عبدالحئی خاں (فرزند شاہ نواز خاں) کی تصنیفات پر بھی نظر ثانی کی[4]،

۳- شفاء العلیل فی اصطلاحات کلام ابی الطیب المتنبی: اس کے متعلق ہم نے نواب صدیق حسن خاں کی تصنیف اتحاف النبلاء المتقین کے حوالہ سے لکھا تھا کہ اس میں متنبی کے کلام کی مخصوص اصطلاحات کی شرح ہے[5]، لیکن مولانا عبدالحئی لکھتے ہیں کہ اس کتاب میں آزاد نے متنبی کے کلام پر اعتراضات کیے ہیں[6]، اور یہی صحیح ہے،

۴- مرآۃ الجمال: اس کتاب کو ہم نے غلطی سے آزاد کی فارسی کتابوں میں شمار کیا تھا لیکن یہ حقیقت میں عربی میں ہے، مظہر البرکات (نسخۂ کتب خانہ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ) کے خاتمہ پر جو

[1] معارف، فروری ۱۹۶۲ء ص ۱۲۸ [2] فارسی شعراء کا تذکرہ ہے [3] علم کلام میں ہے [4] شاہ نواز خاں، بہارستان قلمی، آصفیہ سنٹرل لائبریری، مقدمہ از مٹھن لال تلمیذ ق ۴ ب [5] معارف فروری ۱۹۶۲ء [6] مولانا عبدالحئی: نزہتہ الخواطر (حیدرآباد ۱۹۵۶ء) ج ۶ ص ۲۰۲

درج ہے، اس میں لکھا ہے کہ

"وہاں (حیدرآباد) کے دوران قیام میں عربی میں ایک عمدہ قصیدہ ۱۰۵ اشعار پر مشتمل نظم کیا جس میں معشوق کا سراپا کھینچا اور اس کا نام مرآۃ الجمال رکھا۔"

مولانا عبدالحئی نے بھی لکھا ہے کہ:

"ان کی تصانیف میں ایک کتاب مرآۃ الجمال ہے، جو قصیدۂ نونیہ ہے، اس میں معشوق کے اعضاء کی سر سے قدم تک تعریف ہے یہ قصیدہ ۱۰۵ اشعار پر مشتمل ہے، خود آزاد نے اپنے ساتویں دیوان کے مقدمہ میں اس کے متعلق لکھا ہے کہ یہ قصیدۂ نونیہ ہے جس میں معشوق کے اعضا کی سر سے قدم تک تعریف ہے[1]۔"

مولانا عبدالحئی کے اس واضح بیان کے بعد اس میں کوئی شک و شبہہ نہیں رہ جاتا کہ مرآۃ الجمال عربی میں ہے اور ۱۰۵ اشعار پر مشتمل ہے،

۵- "مثنوی سراپای معشوق" یا مرآۃ الجمال (فارسی): پروفیسر اسٹوری نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ

"مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کتب خانہ (سبحان اللہ کلکشن[2]) میں ایک مخطوطہ مثنوی سراپای معشوق ہے، غالباً یہ مثنوی اور مرآۃ الجمال (عربی) ایک ہی چیز ہے[3]۔"

اوپر ہم لکھ آئے ہیں کہ مرآۃ الجمال عربی میں ہے اور ۱۰۵ اشعار پر مشتمل ہے، "مثنوی سراپای معشوق" بمبئی یونیورسٹی لائبریری کے لائبریرین ڈاکٹر مارشل کے توسط سے ہم نے علی گڑھ سے منگوا کر دیکھی، یہ فارسی میں ہے اور اس میں ۱۲۱۸ اشعار ہیں، ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی لائبریری

[1] مولانا عبدالحئی، نزہتہ الخواطر، جلد ۶ ص ۲۰۲ [2] ایک نسخہ ذخیرۂ احسن میں بھی ہے، اورینٹل کالج میگزین، لاہور ۲۲۵ عدد ۱ (نومبر ۱۹۵۵ء) [3] پروفیسر سی اے اسٹوری، پرشین لٹریچر (لندن ۱۹۵۳ء) ج اول حصہ دوم ص ۸۶۲

کے کیٹلاگر نے اس کا نام "مثنوی سراپای معشوق" محض قیاساً رکھدیا ہے،[1] ورنہ خود آزاد نے اسکا نام مرآۃ الجمال رکھا ہے۔ کتاب کے خاتمہ پر انھوں نے کتاب کی نوعیت، نام، تاریخ تصنیف وغیرہ کے متعلق چند اشعار کہے ہیں، ایک شعر میں وہ کہتے ہیں:-

جمال خوبرویاں دام کردم
کہ مرآۃ الجمالش نام کردم

اس کے فوراً بعد کا شعر ہے:-

چہ رنگیں مصرعش تاریخ سال است
بہار حسن مرآۃ الجمال است
(۱۱۳۹ھ ۱۷۲۶ء)

اس تاریخ سے پھر ایک نئی بات پیدا ہوتی ہے، تذکرۂ ید بیضا کے سلسلہ میں ہم نے لکھا تھا کہ یہ آزاد کی پہلی تصنیف ہے، لیکن اب مرآۃ الجمال (فارسی) کو ان کی پہلی تالیف ماننا پڑے گا، کیونکہ ید بیضا کا سال تصنیف ۱۱۴۵ھ/۱۷۳۲ء ہے، مرآۃ الجمال کی تالیف کے وقت آزاد کی عمر ۲۳ برس تھی۔

مرآۃ الجمال آزاد کی کوئی مستقل تصنیف نہیں بلکہ مختلف شعراء کے اشعار کا مجموعہ ہے، اس کا موضوع محبوب کا سراپا ہے، یعنی محبوب کے اعضا سے متعلق مختلف شعراء کے اشعار کو اکٹھا کیا گیا ہے کہیں کہیں ربط قائم کرنے کے لیے خود آزاد نے اپنے اشعار کا اضافہ کیا ہے، اسی طرح بعض اشعار کی "تفسیر" کے طور پر انھوں نے اپنے اشعار شامل کیے ہیں، سرخیاں سب شعر میں ہیں، اور آزاد ہی کے قلم سے ہیں، ذیل میں ہم چند اشعار نقل کرتے ہیں جو آزاد نے خاتمۂ کتاب پر نوعیت کتاب سے متعلق کہے ہیں، انھیں پڑھ کر کتاب کا صحیح اندازہ ہو سکے گا،

بحمد اللہ کہ انجام سخن شد
قلم در راہ دیگر گام زن شد

الا ای زمرۂ معنی پرستاں
ز جام انتخاب شعر مستاں

مرا کز اہل معنی اقتباس است
ز الطاف شما این التماس است

[1] ذخیرۂ احسن کے مرتب نے بھی اس کا نام سراپای معشوق دیا ہے (اورینٹل کالج میگزین لاہور)

کہ این اشعار را من در زمانی
چو گل واچیدم از ہر بوستانی

ز ہر گلشن گلی آمد بدستم
بنام ایزد عجب گلدستہ بستم

ز چندین مثنوی ہای دل آویز
زدم این انتخاب بہجت انگیز

پی ربط سخن در جمع اشتات
درآوردم ز خود ہم چند ابیات

بتکلیف ضرورت وقت تحریر
بہ بعض ابیات دادم نوع تفسیر

بروی ہر ورق از شعر رنگین
فگندم طرح از بتخانۂ چین

برنگ آمیزئ این نقش پرکار
گرفتم رنگ از لعل لب یار

ز موی کاکل ناہید خامہ
ز بادام سیاہ حور نامہ

مداد تازہ از سرمۂ پاک
دوات آسود از مژگان چاک

ورق از صفحۂ رخسار گلرنگ
زدم نقش جبیں تصویر رنگ

جمال خوبرویاں دام کردم
کہ مرآۃ الجمالش نام کردم

چہ رنگین مصرعش تاریخ سال است
بہار حسن مرآۃ الجمال است

جن جن شعراء کی مثنویوں سے اشعار لیے گئے ہیں ان کے نام بھی آزاد نے بتا دیے ہیں، مثلاً

نظامی مقتدای نکتہ سنجاں
امام و پیشوای نکتہ سنجاں

امیر خسرو ملک معانی
باقلیم سخن صاحبقرانی

چکیدہ از نظم سیراب زلالی
زلال تازۂ شیریں مقالی

ان کے علاوہ مندرجۂ ذیل شعراء کے اشعار بھی انتخاب میں لیے گئے ہیں:-

عصار، جامی، ہاتفی، ندردی (؟) موجی، ناظم، غزالی، کلیم، قدسی، اقدس، اشرف، نیر، ناصر علی، راسخ، غنیمت، رضا، فیاضی، عبد الجلیل بلگرامی۔

عبدالجلیل بلگرامی، آزاد کے نانا بھی تھے اور استاد بھی، آزاد نے پہلے تو بلگرام میں ان سے
حدیث کی سند لی، پھر جب وہ شاہ جہاں آباد جانے لگے تو آزاد بھی ان کے ساتھ گئے، اور
تین سال وہاں رہ کر مزید کسب فیض کیا، اس لیے آزاد نے ان کا ذکر نہایت عقیدت و
احترام سے کیا ہے، انھوں نے اپنے نانا اور استاد کی بارہ اشعار میں مدح کی ہے، مثلاً

دگر عبد الجلیلِ بلگرامی — بہار گلشنِ رنگیں کلامی
گرامی گوہر درج سیادت — درخشاں نیر برج سعادت

آخر میں ان سے اپنے کسب فیض کا اظہار اس طرح کیا ہے:

منم گلچینِ گلزار کمالش — کمیں شاگرد و فرزند و غلامش
ازاو ہر گونہ علم آموختم من — ہنوز او چراغ افروختم من
چمن شد سینۂ من از سحابش — یمن شد خاطرِ من زآفتابش
من از شکر خدا رطب اللسانم — کہ بخشیدہ دو فخر اندر جہانم
یکی فرزندئ او فیضِ تخمیر — کہ قلب من از او گردید اکسیر
دگر جدم امیر المومنین است — علی مرتضیٰ سلطانِ دین است

کتاب کا خاتمہ ان اشعار پر ہوتا ہے:

کسی کز سیر ایں گلشن شود شاد — مرا ہم از توجہ آورد یاد
کریماں را بود فضل و کرم خو — دعاء خیر احسانت نیکو

۶- حیات جلیل مصنفہ مولوی سید مقبول احمد صمدنی کے حوالہ سے ہم نے لکھا تھا کہ آزاد کی زندگی
کے تقریباً ۴۸ سال دکن میں گذرے، اس طویل مدت میں بہت سے واقعات و حادثات پیش
آئے لیکن وہ بلگرام نہ گئے، خود مصنف کے الفاظ یہ ہیں:-

"آزاد نے اپنی عمر کا بڑا حصہ (اڑتالیس سال) دکن میں گزارا، شفیق ماموں اور استاد
(امیر سید محمد) کے مرنے، نوجوان اکلوتے بیٹے (میر نورالحسن) کے غرق آب ہونے، خالہ زاد
اور عزیز تر از جان بھائی (محمد یوسف) کی وفات اور پیارے سے پیارے رشتہ داروں
کی مفارقت دائمی اختیار کرنے کی خبریں آتی رہیں، مگر یہ دکن میں کچھ ایسے پاؤں توڑ کر
بیٹھے کہ اٹھنا اور ہٹنا گوارا نہ کیا ...... اپنے بھتیجہ (غلام امام صادق کے بیٹے)
میر اولاد محمد ذکا اور اپنے پوتے امیر حیدر کو اپنے پاس دکن میں بلا لیا، اور وہیں ان کی
تربیت و پرداخت عالمانہ اور امیرانہ طریقہ پر کی، اپنی صحبت گرامی کے فیض اور علوم عالیہ
سے بہرہ دار فرد کر کے وطن کو رخصت کر دیا، یہ لوگ یہاں آکر پھولے پھلے مگر آزاد کو اپنی
طرف کھینچنے میں ناکام رہے۔"[1]

معلوم نہیں مولوی مقبول احمد کا ماخذ کیا ہے، ہمارے سامنے مولانا شبلی کی ایک تحریر ہے
جس سے مندرجہ بالا بیان کی تردید ہوتی ہے، مآثر الامراء کے سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں کہ
"صمصام الدولہ شاہ نواز خاں ...... نے ایک کتاب خاص اس موضوع پر
لکھنی چاہی کہ بابر کے زمانہ سے اخیر عہد تک دولت تیموریہ میں جس قدر عہدہ دارانِ سلطنت
گذرے ہیں سب کے حالات قلم بند کیے جائیں، چنانچہ مآثر الامراء کے نام سے اس کتاب
کی تدوین و ترتیب شروع کی، پورے پانچ برس اس کام میں صرف ہوئے، اگرچہ
امیر موصوف کا علمی پایہ خود اس قدر بلند تھا جو ایسی تصنیف سے عہدہ برآ ہونے کے لیے
کافی تھا، تاہم امارت کی راحت پرستی سے حسب دلخواہ سامان نہ ہو سکا، امیر موصوف
اس نکتہ سے غافل نہ تھے، انھوں نے اس موقع پر آزاد کو یاد کیا، یہ اس وقت اپنے

[1] مولوی مقبول احمد صمدنی، حیات جلیل (الہ آباد ۱۹۲۹ء) حصہ دوم ص ۱۶۸ تا ۱۷۱

وطن بلگرام میں تھے، وہیں قاصد بھیجا، اور سفر کے لیے ہر طرح کے سامان مہیا کیے، میں نے حیدرآباد میں خود آزاد کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک خط دیکھا ہے، جس میں وہ ایک دوست کو لکھتے ہیں کہ نواب صمصام الدولہ نے مآثر الامراء کا مسودہ بھیجا ہے، کتاب اچھی ہے لیکن نگر ترتیب کے لحاظ سے سخت اصلاح کی محتاج ہے، میں نے نواب موصوف کو لکھا کہ یہ کام اتنی دور سے انجام نہیں پا سکتا، نواب نے میرے لیے پالکی کی ڈاک کا انتظام کر دیا ہے، دو مہینے میں اورنگ آباد پہنچوں گا اور مسودہ کو درست کر دوں گا"[1]

مولوی مقبول احمد نے اپنے بیان کی تائید میں کوئی ثبوت پیش نہیں کیا ہے، ان کے برعکس مولانا شبلی نے ایک ایسا ثبوت پیش کیا ہے، جس کی صداقت و وزن سے انکار نہیں ہو سکتا، اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ نواب صمصام الدولہ شاہ نواز خاں ۱۱۷۱ھ/۱۷۵۸ء میں قتل ہوئے، اس لیے یہ قطعی ہے کہ مذکورۂ بالا خط ۱۱۷۱ھ/۱۷۵۸ء سے پہلے کا ہے، اور اگر آزاد اپنے پروگرام کے مطابق اورنگ آباد پہنچے تو ۱۱۷۱ھ/۱۷۵۸ء سے پہلے پہنچے، ۱۱۶۸ھ/۱۷۵۴ء میں آزاد کے اکلوتے صاحبزادہ نور الحسن ایک تالاب میں غسل کرتے وقت غرق ہو گئے،[2] بہت ممکن ہے کہ اس حادثۂ دلدوز کی خبر پا کر آزاد بلگرام گئے ہوں اور دو تین سال (۱۱۷۱ھ/۱۷۵۸ء تک) وہیں رہ گئے ہوں۔

۷۔ ہم نے آزاد کا ایک شعر خزانۂ عامرہ سے اس طرح نقل کیا تھا،

حبابم ہشت من از گوہری منت تہی آمد   نباشد عیب گر خود را بدریا آشنا کردم[3]

مولانا غلام رسول مہر (لاہور) نے معارف (اپریل ۱۹۶۲ء) میں لکھا ہے کہ یہ شعر اگرچہ مطبوعہ خزانۂ عامرہ میں اسی طرح چھپا ہے لیکن یہ صحیح نہیں، مولانا کا اعتراض بجا ہے، ہمارے خیال میں یہ شعر یوں ہونا چاہیے:۔

[1] مولانا شبلی، مقالات شبلی حصہ پنجم (اعظم گڈھ) طبع دوم ص ۱۲۳ [2] مولوی مقبول احمد، حیات جلیل حصہ دوم ص ۱۷۴، حاشیہ [3] معارف، مارچ ۱۹۶۲ء ص ۱۹۲

حبابم ہشت من از گوہر منت تہی آمد   نباشد عیب گر خود را بدریا آشنا کردم

مولانا مہر کا خیال ہے کہ یہ شعر اس طرح ہونا چاہیے:

حبابم رشت من از منت گوہر تہی آمد   نباشد عیب گر خود را بدریا آشنا کردم

۸۔ ہم نے لکھا تھا کہ نواب نظام الدولہ ناصر جنگ سے آزاد کے بڑے گہرے تعلقات تھے، نواب ان کا بہت احترام کرتے تھے،[1] دائرۂ معارف اسلامیہ (اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام) میں آزاد پر جو مضمون ہے، اس میں مندرجۂ ذیل بیان ملتا ہے:

"ناصر جنگ جب ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء میں اپنے باپ کے جانشین اور صوبہ دار دکن مقرر ہوئے تو اپنے استاد (آزاد) کا بے حد ادب ملحوظ رکھتے تھے، اور آپ کو بطور جاگیر "التمغا" موضع ہرسول،[2] اورنگ آباد عطا کیا تھا۔"[3]

نواب سید محمد خاں صلابت جنگ بھی آزاد کے قدردانوں میں تھے، چنانچہ مذکورۂ بالا بیان میں یہ بھی تحریر ہے کہ

"نواب سید محمد خاں صلابت جنگ نے آپ کی خدمات اور خیر خواہی ملک و رعایا کے صلے میں صدارت کل کی خدمت اور سراج المحدثین و رئیس العلماء کا خطاب عطا فرمایا تھا، (اصل سند بمہر بسالت جنگ دیوان شریف خاں مورخہ ۱۱۷۳ھ کتب خانۂ سید علی اصغر بلگرامی نبیرۂ آزاد در حیدرآباد، دکن میں ہے)"[4]

اسی طرح نواب نظام علی خاں، اسد جنگ بہادر، آصف ثانی بھی ان کی عزت کرتے تھے، صاحب محبوب الزمن نے مآثر آصفی کے حوالہ سے مندرجۂ ذیل واقعہ کا ذکر کیا ہے:

[1] معارف، مارچ ۱۹۶۲ء ص ۱۹۴ [2] اورنگ آباد سے تین میل کے فاصلہ پر گندہ نالا کے کنارے یہ واقع ہے، ڈسٹرکٹ گزیٹیر (اورنگ آباد) کا مرتب لکھتا ہے کہ اسکی شاندار سرائیں، مقبرے، ویران باغات وغیرہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ بستی کبھی بہت اچھی حالت میں تھی (ص ۸۲۰) [3] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ (لاہور ۱۹۶۲ء) ج ۱، کراسہ ۲ ص ۱۰۵ [4] ایضاً

"جب حضرت آزاد بتقریب سیر یا بسبب طلب بعض احباب حیدرآباد تشریف لائے اور
شاہ علی بنڈہ پر قریب دروازۂ علی آباد لب سڑک پر فروکش ہوئے، قائم الدولہ نے آپ کی
تشریف آوری سے خبر دی، آپ نے فرمایا کہاں فروکش ہوئے ہیں؟ وہ ہمارے مہمان ہیں، ان کو مکان
عزیزیہ پر اتارنا چاہیے، قائم الدولہ نے فرمایا کہ علی آباد کے دروازہ کے قریب فروکش ہیں، فرمایا
آج ہم اس راہ سے تفریحاً جائیں گے، محل فرودگاہ کے قریب سواری پہنچے تو ہم کو مطلع کرنا،
آپ حسب قرارداد سہ پہر کو ہاتھی پر سوار دروازہ کے قریب پہنچے، نقیب نے عرض کیا،
حضور یہ آزاد کا فرودگاہ ہے، آپ ہاتھی سے اتر رہے تھے کہ حضرت آزاد حاضر ہوئے، نذر
دکھلائی حضور خیر و عافیت دریافت کرکے روانہ ہوگئے، سیر سے مراجعت کرکے آئے، قائم الدولہ کو حکم دیا کہ حضرت
کے لیے ایک ہزار روپیہ مزد قدم و شست سر بھیج دیجئے، فوراً حکم کی تعمیل ہوئی، حضرت
آزاد نے عطیۂ حضور کو منظور فرمایا اور شکریہ ادا کیا، دوسرے روز آپ حضور سے ملے، حضور
آپ کی ملاقات سے بہت مسرور ہوئے، پوچھا، آپ کب تک یہاں رہیں گے؟ آپ نے
فرمایا، چند روز، حکم صادر ہوا کہ آپ ہمارے مہمان ہیں، ہر روز صبح و شام آپ کے لیے خاص
ہمارے خاصہ سے ماحضر طعام بھیجتے رہیں، جب تک آپ رہے خاصہ کے طعام سے سرفراز رہے"[1]

۹۔ بچھمی نرائن شفیق کے حوالہ سے ہم نے لکھا تھا کہ آزاد نے احمد شاہ ابدالی کی فتح جنگ پانی پت
سے چھ سال پہلے ایک قطعہ اس انداز سے کہا تھا گویا یہ واقعہ عالم رویا میں متعین ہو چکا تھا[2]، لیکن
خود آزاد نے خزانۂ عامرہ میں چھ ماہ لکھا ہے۔ آزاد کے الفاظ یہ ہیں:

"از نوادر اتفاقات این کہ فقیر در ماہ محرم سنہ اربع وسبعین ومایۃ والف شش ماہ
پیش از وقوع محاربہ بر سبیل تفاؤل غزلی نظم کردم"[3]

---

[1] عبدالجبار خاں ملکاپوری، محبوب الزمن، ج اول ص ۴۸ [2] معارف، مارچ ۱۹۶۲ء ص ۲۰۱ [3] آزاد بلگرامی
خزانۂ عامرہ (کانپور ۱۸۷۱ء) ص ۱۰۹

اس غلطی کی طرف بھی مولانا مہر ہی نے اشارہ کیا تھا۔

۱۰۔ مذکورہ بالا غزل کے تیسرے شعر کے دو لفظ پڑھے نہیں جا سکے تھے۔ اگرچہ اس کی تصحیح مولانا
مہر نے اپنے استدراک میں (معارف اپریل ۱۹۶۲ء) کر دی تھی، پھر بھی ہم اسے یہاں صحیح شکل میں
نقل کر دینا مناسب سمجھتے ہیں:-

شکر خدا کہ کزلک تصحیح حک نمود — نقش غلط کہ صفحۂ ایام را گرفت

۱۱۔ پٹنہ یونیورسٹی لائبریری (پٹنہ) کے مخطوطات کی فہرست میں ایک کتاب طبقات
سلاطین ہے، جسے آزاد بلگرامی کی تصنیف بتایا گیا ہے، جناب ڈاکٹر افضال امام صاحب
(لائبریرین) نے ہماری درخواست پر اس کے دیباچہ اور خاتمہ کی نقل ہمیں عنایت فرمائی۔
دیباچہ کی عبارت سے کتاب کا ایک ہلکا سا اندازہ ہو جاتا ہے۔

مخطوطہ کا پہلا ورق غائب ہے، دوسرا ورق اس طرح شروع ہوتا ہے۔

اِنَّ اللہ وملٰئکتہٗ ....

اس کتاب کا سبب تالیف خود آزاد کی زبان سے سننا زیادہ مناسب ہوگا، وہ کہتے ہیں کہ
"اکنون آنکہ چوں استنباط غرائب حالات واستخراج نوادر اتفاقات کہ فی الحقیقت
غرض اصلی از تدوین فن تاریخ و سیر و علۃ غائی اصحاب خبرت و ارباب خبر الناست
بہ (ہر) کس بسہولت میسر نیست چہ بعد از طی صحائف کتب مبسوط احیاناً این نوع واقعۂ
حیرت افزا و پس از مطالعۂ مطولہ گاہ گاہ خاطر از امثال این احوال غریب تا مل محظوظ
می شود لاجرم چنان بخاطر ذرۂ بی مقدار ساقط از درجۂ اعتبار مجدد این رسم مجدد الآثار
فقیر میر غلام علی آزاد ...... تافت کہ این در ر غرر از لجۂ سفائن معتبر و این جواہر آبدار
از معادن مؤلفات ارباب اخبار بر چیدہ نثار بارگاہ سازد ......

برای عبر انجلای متنجران بدیع احوال و مستحضران نوادر اقوال مخفی نخواهد بود کہ چون دریں صحیفہ ایراد سوانح و قضایای را کہ فی الجملہ غرابتی داشتہ باشد ملتزم است و اکثر آں وقائع منسوب بسلاطین ایام و معرفت ایشان را دخلی تمام در ایضاح مرام بدان وسیلہ تذکار طبقات سلاطین و زمان تسلط ہر یک علی وجہ الایجاز از مساعدت وقت مترقب است، اما چون اظہار کیفیت ظہور ہر خاندان و موجبات زوال دولت و استیصال آں دودمان بآنکہ دخلی تمام در انتظام کلام و توضیح مقام داشت سر رشتۂ مقصود را از دست می برد و حرف معمول از صفحۂ مسئول می سترد بالضرورۃ صرف عنان یکران از آں وادی نمودہ مناسب چنان دید کہ سطری از آں حالات بیا فزاید فوایدی کہ بقدر مناسبتی بسیاق سخن داشتہ باشد در حواشی این جریدہ مرقوم گرداند، از آں جملہ ہر حاشیہ کہ بواسطۂ ارتباط کلام در سلک تحریر منتظم می گردد آں را رابطہ دانند بنا بر از دیاد و انتباہ واقع اشتباہ سمت تسطیر می یابد ضابطہ بالجملہ چون تنمیم ایں حالات و توجیہ ایں مقالات بالحاق روابط و الصاق ضوابت (؟) منوط و مربوط است لہذا ایمای بتسطیر آں سطور و اظہار اہتمامی بتحریر آں زبور واقع شد ۔"

کتاب کے خاتمہ پر مندرجۂ ذیل شعر درج ہے :۔

پی تاریخ اتمامش تفکر کردم	خرد گفتا کہ ہست ایں نکتہ جامع

۱۱۴۰ھ

یہ نسخہ ۱۳۶ اوراق پر مشتمل ہے اور ۲۹ محرم ۱۱۹۷ھ کو اس کی کتابت کی تکمیل ہوئی ہے۔

آخر میں دو تین جزوی غلطیوں کی تصحیح کر دینا بھی نامناسب نہ ہوگا،

(۱) ہم نے لکھا تھا کہ نظام الملک سواد بھوپال میں مرہٹوں سے نبرد آزمائی میں مصروف تھے، کہ نادر شاہ کی آمد کی خبر مشہور ہوئی اور انھوں نے مرہٹوں سے صلح کر لی اور دکن کا رخ کیا۔[1] نظام الملک نے دکن کا رخ نہیں کیا بلکہ وہ دہلی گئے،

(ب) ماثر الامراء کے سلسلہ میں ہم نے لکھا تھا کہ صمصام الدولہ شاہنواز خاں ۱۱۷۱ھ (۱۷۵۸ء) میں ایک معرکہ میں کام آئے[2] یہ صحیح نہیں، انھیں ایک غلط فہمی کی بنا پر فرانسیسیوں نے نہایت بے دردی سے قتل کر دیا تھا، اسی لیے ان کے نام کے ساتھ اکثر شہید لکھا جاتا ہے۔

(ج) گربہ نامہ کے سلسلہ میں ہم نے لکھا تھا کہ سید وجاہت حسین کا خیال ہے کہ یہ "نظم" پند و نصیحت کا کام کرتی ہے۔[3] مضمون کے چھپنے کے بعد ہمیں گربہ نامہ کا ایک مطبوعہ نسخہ ملا، یہ دراصل نثر میں ہے، لیکن مذکورۂ بالا غلطی کے ذمہ دار سید وجاہت حسین نہیں ہیں، ہم نے غلطی سے "نظم" کا لفظ لکھ دیا، ورنہ انھوں نے انگریزی میں لفظ (Piece) استعمال کیا ہے۔

---

[1] معارف، جنوری ۱۹۶۲ء ص ۱، [2] معارف فروری ۱۹۶۲ء ص ۱۲۰، [3] ایضاً ص ۱۳۲

بزم تیموریہ

بابر ایک بےمثل اہل قلم تھا، ہمایوں نے شعر و شاعری کے علاوہ ہیئت و نجوم کی بھی انجمن آرائی کی، اکبر کا عہد علوم و فنون کی روشنی سے جگمگا اٹھا، جہانگیر نے ادب و انشا کو چمکایا، شاہ جہاں نے شعراء اور فضلاء کو سیم و زر سے تلوایا، عالمگیر نے معارف پروری اور انشاء پردازی کے اعلیٰ نمونے پیش کیے، اس خانوادہ کے آخری بادشاہوں نے بھی اپنے اسلاف کی روایات کو قائم رکھنے کی کوشش کی، بہادر شاہ ظفر نے عروس سخن کے گیسو سنوارے، تیموری شہزادوں اور شہزادیوں نے بھی علم و ادب کی محفلیں سجائیں، دربار تیموری کے امراء، شعراء اور فضلاء نے شاہانہ سرپرستی میں گوناگوں کمالات دکھائے، ان سب کی تفصیل اس کتاب میں ملاحظہ فرمائیے۔

(مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب ایم اے)۔ ۴۰۸ صفحے۔ قیمت للعہ

منیجر

دیوان اویس بیگ فطرت

از جناب ڈاکٹر سید امیر حسن صاحب عابدی لکچرار فارسی دہلی یونیورسٹی

تذکرہ نویسوں نے کوشش کی ہے کہ زیادہ سے زیادہ شعرا کا تعارف کرائیں، اور بہت سے شعرا کا نام صرف ان تذکروں کی وجہ سے محفوظ ہوگیا ہے، چنانچہ ان چند اشعار کے علاوہ جو ان تذکروں میں نقل کردیے گئے ہیں، نہ ان کے کسی دیوان کا پتہ چلتا ہے نہ کلیات کا، اس کے مقابلہ میں بعض ایسے شعرا بھی ہیں جن کے دیوان اور کلیات موجود ہیں، مگر خود ان کے حالات کسی تذکرہ سے معلوم نہیں ہوتے، فطرت بھی انھیں بدقسمت یا خوش قسمت شعرا میں ہے جس کو تذکرہ نویسوں نے بھلانے کی کوشش کی، مگر اس کا نام اس کے دیوان کے ایک قلمی نسخہ کی وجہ سے جو انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ ہے (نمبر ۱۵۶۰) ہمیشہ کے لیے باقی رہے گا،

ایک اور مشہور شاعر میر معز فطرت[۱] بھی گذرے ہیں اور بعض لوگوں نے ان دونوں کو ایک میں ملا دیا ہے، جو غلط ہے، خود اس قلمی نسخے کے شروع میں کسی نے غلطی سے یہ لکھ دیا ہے "دیوانِ معز فطرت" مگر یہ درست نہیں ہے،

اس فطرت کے متعلق جو معلومات بھی حاصل ہوتے ہیں، وہ صرف اس کے دیوان سے معلوم ہوتے ہیں، اس شاعر کا نام اویس بیگ اور تخلص فطرت ہے، فطرت سنہ ۱۰۰۷ھ مطابق سنہ ۱۵۹۸-۹۹ء

۱؎ میر معز الدین محمد موسوی متخلص بہ فطرت و موسوی، ولادت: سنہ ۱۰۵۰ھ مطابق سنہ ۱۶۴۰-۴۱ء، وفات سنہ ۱۱۰۱ھ مطابق سنہ ۱۶۸۹-۹۰ء ۲؎ ورق ۱ الف

میں پیدا ہوا، وہ اصلاً کاشان کا رہنے والا تھا، اور اپنا وطن چھوڑنے پر شروع میں اس کو بڑی تکلیف ہوئی تھی، جس کا اظہار اس شعر سے ہوتا ہے،

نیست صبرم ز وطن چند جدائی فطرت ... سوختم سوختم از حسرتِ کاشان رفتم

مگر جب بعد میں شیراز میں مستقل مقیم ہوگیا تو کاشان کو بھول بیٹھا:

فطرت از بادۂ گلگون نتواں کند طمع ... کار سختیست ز شیراز بکاشان رفتن

اور غالباً وہیں سے ہندوستان آیا تھا:

آخر از شیراز فطرت چشم بد دورم کند ... گلشن فردوس و سیر کوچہ باغ از دست رفت

انڈیا آفس لائبریری کی فہرست میں ہے کہ فطرت شاہ عباس کبیر کے درباریوں میں سے ہوگا، اور اس کے بعد ہندوستان گیا ہوگا، اس لیے کہ اس نے شاہ عباس[۱]، بیجاپور کے بادشاہ عادل شاہ[۲] اور جہانگیر[۳] کے وفات کی تاریخیں کہی ہیں،

معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۰۲۳ھ مطابق سنہ ۱۶۱۴ء میں جب کہ فطرت صرف سولہ برس کا تھا، اس کو شاعری میں اچھی خاصی شہرت حاصل ہوگئی تھی، چنانچہ خود اس نے اور میر حیدر نے اس شہرت کی تاریخ کہی ہے،

غالباً سنہ ۱۰۳۸ھ مطابق سنہ ۱۶۲۸-۲۹ء میں یا اس سے کچھ پہلے وہ ہندوستان کے سفر پر چلا تھا، اور ایران سے فطرت دکن پہنچا، اور وہاں اس نے فوج میں نوکری کی، چنانچہ اس نے اپنے شبخون مارنے کی تاریخ کی ہے، اور اپنے کو عادل شاہ کا غلام بتایا ہے،

غلام خسرو ہندیم بعد ازیں فطرت ... خریدہ است چو یوسف شہ دکن ما را

۱؎ سنہ ۹۹۵ھ - سنہ ۱۰۳۸ھ مطابق سنہ ۱۵۸۷ء - سنہ ۱۶۲۹ء ۲؎ ابراہیم عادل شاہ ثانی سنہ ۹۸۸ھ - سنہ ۱۰۳۷ھ مطابق سنہ ۱۵۸۰ء - سنہ ۱۶۲۷ء ۳؎ سنہ ۱۰۱۴ھ مطابق سنہ ۱۶۰۵ء - سنہ ۱۰۳۷ھ مطابق سنہ ۱۶۲۷ء

۱۰۴۱ھ مطابق ۱۶۳۱-۳۲ء میں اسے ایک گھر مل گیا تھا، جس کی تاریخ اس نے کہی، بیجاپور کے علاوہ وہ برہانپور میں بھی رہا تھا، اور وہاں اس کے پاس ایسا بوسیدہ مکان تھا کہ برسات کے موسم میں اس میں رہنا مشکل ہو گیا،

آمد برسات وسخت تر می گردیم
در جستن خانہ در بدر می گردیم

در آب وگل خرابۂ برہانپور
سرگشتہ چو چرخ کوزہ گری گردیم

غالباً دکن سے کشمیر کے ارادہ سے وہ شمال ہند کی طرف آیا تھا:

میکنم عزم سفر تا چند فطرت در دکن
صبحدم فیض ہوا تکلیف کشمیرم کند

مگر اس کا کوئی اور ثبوت نہیں ملتا،

شمال ہند میں غالباً وہ جہانگیر کی وفات کے بعد آیا ہے، اس لیے اس کو دربار جہانگیر تک پہنچنے کا موقع نہ ملا ہوگا، لیکن اس نے جہانگیر کو "شاہ سخن رس" کہکر یاد کیا ہے اور اس طرح انکا ذکر کیا ہے جیسے اس کو اس کا ذاتی تجربہ تھا:۔

یارب مباد عہد جہانگیر را زوال
فطرت بدہر شاہ سخن رس غنیمت است

فطرت کو ہند اور ہندوؤں سے بڑی محبت تھی:۔

من ز ذان ہند و پسر خود ترک ایمان میکنم
کافری زاہد ببیں در حلقۂ زنارکیست

دلبستہ ام بصحبت شکر لبان ہند
طوطی صفت گرفتہ ز ہندوستان دوم

اس کے باوجود اس کو اپنے وطن کی یاد برابر ستاتی رہی،

فطرت از یاری طالع پر و بالی خواہم
چند در ہند دلم یاد کند ایران را

فطرت افتادہ بہند است ز پرواز غلط
عجب است اینکہ با یران ز دکن باز آید

فطرت بہند ماندہ ام از عیش می نصیب
یاد بخاری و ہوس برف می کنم

فطرت کا سال وفات معلوم نہ ہو سکا، مگر اس کے آخری قطعۂ تاریخ سے ۱۰۵۹ھ (۱۶۴۹ء) نکلتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا انتقال اس کے بعد ہی اور اس کے لگ بھگ ہوا ہوگا،

فطرت کے بھائی محمد بیگ، کریم بیگ، ہمزہ بیگ اور ہاشم بیگ تھے، اس کے ایک لڑکے کا نام سنجر بیگ تھا، جو ۱۰۴۶ھ (۱۶۳۶-۳۷ء) میں ایران سے آیا تھا، اور دوسرا علی بیگ سنجر بیگ کے لڑکے اور فطرت کے پوتے کا نام نصر بیگ تھا،

فطرت ایک قانع اور بلند نظر انسان تھا:

نظر بمال کسی نیست زانکہ چون خاتم
پر است دیدہ سیرم گرم تہی ست شکم

اگر حاسد ترا بد گفت فطرت
بر بند از شکوۂ دشمن زبان را

وہ ہجو سے حتی الامکان پرہیز کرتا تھا، مذہبی آدمی تھا، مگر وسیع المشرب انسان تھا، چنانچہ کہتا ہے:

باسلام و کفرم چہ فطرت چہ کار
مرا مشرب خوش بہ از مذہب است

فطرت ز بسکہ ہست بہر مشرب آشنا
با شیخ توبہ کرد و بمستان شراب خورد

فطرت کو اپنے کلام پر بھی ناز تھا،

فطرت ہوس پیروی طبع قدوا ریم
زان روی کہ طرز سخن تازہ چنین است

با تو فطرت نتوانیم ز دل لاف زنیم
آنکہ شاگرد تو شد در خور استادی ماست

فطرت آن معنی طرازم من کہ اقبال بلند
می کند در یوزہ نور آفتاب از احترام

شعر وہی ہے جو دل پر اثر انداز ہو،

شعر می باید ز معنی ناخنے بر دل زند
ہر کہ بیتی گفت فطرت صاحب استعداد شد

خیالات و مضامین کے ساتھ حسن الفاظ بھی ضروری ہے،

از شعر گرت دیدهٔ تحسیں باشد بایدمعنی ز لفظ رنگیں باشد

در لفظ تلاش کن کہ معشوقۂ خوب حیف است کہ در لباس چرکیں باشد

دیوان فطرت میں ۶۴۲ اشعار کے قصیدے، ۱۲۵۹ ابیات کی مثنویات، ۵ شعر کے ترکیب بند، ۳۲۵۵ اشعار کی غزلیں، ۵۷۹ اشعار کے قطعے اور چار سو رباعیاں ہیں، کل اشعار کی مجموعی تعداد ۶۵۸۵ ہے۔

قصیدے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت علی مرتضیٰ، امام حسین، امام موسیٰ کاظم علیہم السلام وغیرہ کی مدح میں ہیں، ایک قصیدہ کے چند شعر نمونۃً نقل کیے جاتے ہیں:۔

دیدہ در عشق در فشاں کردم سینہ از داغ بوستاں کردم

نالہ ہر گہ شد آشنای لبم رخنہ در سقف آسماں کردم

از خمیرش چو یاد آوردم در عرق مہر را نہاں کردم

ہر بیاباں کہ طی شد از شادی خاک در چشمہ آسماں کردم

ان قصیدوں میں کسی بادشاہ یا امیر کی مدح وستایش نہیں ملتی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فطرت درباری شاعر نہ تھا۔

فطرت نے دو مثنویاں کہی ہیں، ایک مثنوی کا نام "خواب وخیال" ہے، جو اس بیت سے شروع ہوتی ہے:

الٰہی نالہ ام را تازگی بخش صفیرم را بلند آوازگی بخش

اس مثنوی میں چھوٹی چھوٹی حکایتیں اور تمثیلیں ہیں اور جیسا کہ خود عنوان سے ظاہر ہے، زیادہ تر خواب وخیال کی باتیں بیان کی گئی ہیں، اس کے اشعار کی تعداد ۱۱۵۶ ہے۔

پہلے ایک حسین معشوقہ کا ذکر ہے جو عالم خواب میں شاعر کے پاس آتی تھی:۔

ز عنبر نقطہا بر گل فشاندہ گلی در سایۂ سنبل نشاندہ

گل عارض چراغ شام زلفش دل صد آرزو در دام زلفش

سرین نازکش را بار بودی گرش از برگ گل شلوار بودی

اس کے بعد ایک قمری کا ذکر ہے، جو قفس میں رہتے رہتے باغ کو بالکل بھول گئی تھی،

تیسرا قصیدہ یعقوب لیث نامی چور کا ہے:

حریفی کو بہر جا بود راہش زبادہ نشأ دزدیدی نگاہش

اگر کردی لبوی باغ آہنگ ز برگ سبز بردی چون خزاں رنگ

نگاہش را بگردوں گر بدی راہ ربودی روشنی از عارض ماہ

جب بادشاہ نے اس سے چوری کا سبب پوچھا تو اس نے کہا:

کہ دوشش از مفلسی و بینوائی بہر در رفتم از بہر گدائی

ندیدم محرمی از کشور خود؟ کسی نگشود بر رویم در جود

اس کے بعد ایک اور عالم خواب کا ذکر ہے:

نظر بردی گل غلطیدہ می رفت نگہ از ہر طرف گلچیدہ می رفت

جس میں ایک برہنہ حسینہ پتھر پر بیٹھی ہوئی دکھائی دی:۔

برہنہ بر سر سنگی نشستہ پرند از برگ گل بر خویش بستہ

وہ شاعر کی طرف مائل ہوئی:۔

بیا با ہم بکام دل بجوشیم بہ غم چشم بہ ساغر بنوشیم

مگر اس کو ایک زخمی شیر نے ہلاک کرکے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا،

پانچواں قصیدہ ایک بڈھے کا ہے جسے عالم خواب میں ایک جوان دکھائی دیا:۔

قمر پیمانۂ گردوں سبوئی
خرابات آشنا بیگانہ خوئی

زمستی با می و مطرب بجنگی
گلوی شیشہ از دستش بتنگی

اس بڈھے نے اسے دولت دیکر اس سے جوانی خرید لی، اس کے بعد اس درویش کا قصہ ہے جو شیطان کے دھوکہ دینے سے بادشاہ بن گیا تھا، اس میں شاعر نے یہ عقیدہ ظاہر کیا ہے کہ خداوند عالم حسب استعداد لوگوں کو فقیر اور بادشاہ بناتا رہتا ہے۔

خدا آنرا کہ درویش آفریدہ
یقینش در خور شاہی ندیدہ

چھٹی تمثیل میں حضرت موسیٰؑ کے ایک بڈھے شرابی کی تنگدستی کو دیکھکر دعا کرنے اور اسکے دولت مند ہونے کے بعد شرانگیزی اور قتل و خون کو بیان کیا گیا ہے، اس کے بعد کی تمثیل میں یہ بیان کیا ہے کہ شیطان نے ایک دیوار پر تھوڑا سا شہد لگا دیا، اس میں چیونٹیاں آکر بھر گئیں، ان کو دیکھکر ایک حسین بچے کا کبوتر جھپٹا، اس کو ایک ترک کے باز نے حملہ کرکے ختم کر دیا، اس پر اس بچہ نے باز کو مار ڈالا، اور پھر ترک نے بچہ کو قتل کر دیا، اس بچہ کے قتل کی وجہ سے لوگ جمع ہو گئے اور سب نے مل کر اس ترک کو قتل کر ڈالا، اس کے بعد ایک بادشاہ کا قصہ ہے جو مست ہو کر سو گیا، اور بیماری میں منت مانی کہ اگر اچھا ہو جائے گا تو درویشوں کی سی زندگی بسر کرے گا، اور اپنی دولت کو غریبوں میں تقسیم کر دے گا۔

اس کے بعد مامون کا قصہ ہے کہ اس نے خواب میں دیکھا کہ اس کی ماں اس سے کہہ رہی ہے کہ اس نے ایک تھیلی اشرفی دیکر بہلول نامی معمار سے اپنا محل بنوایا تھا، لیکن جب مامون نے اس سے اپنا محل تعمیر کرنے کی خواہش کی تو اس نے دو تھیلی اشرفی کا مطالبہ کیا، مامون نے اس کا سبب پوچھا تو بہلول نے کہا کہ اسکی ماں نے بغیر دیکھے ایک تھیلی اشرفی دی تھی لیکن مامون کو دیکھنے کے بعد دوگنی اجرت دینی پڑے گی۔

آخر میں شاعر نے دو ہندو عاشق و معشوق کا قصہ بیان کیا ہے، جن کو دریا میں ڈوب کر وصال نصیب ہوا۔

فطرت نے دو ترکیب بند کہے ہیں، جن میں سے ایک میں کسی نامعلوم آدمی کی مدح اور دوسرے میں امام قلی خاں حاکم شیراز کی ستایش کی گئی ہے۔

اس دیوان میں غزلیات کا حصہ اس شعر سے شروع ہوتا ہے:۔

جہاں مجنوں برد بیتاب ہر دم نام لیلی را
کہ نشنیدست پنداری بجز حرف تسلی را

فطرت ایک متوسط درجہ کا شاعر ہے، اس کے اشعار عام طور سے نہ بہت بلند ہوتے ہیں نہ پست، یہ ضرور ہے کہ ہزاروں شعروں میں بہت سے ایسے اشعار مل جاتے ہیں جو روانی، سلاست اور تغزل میں بے نظیر ہوتے ہیں۔

فریاد کہ نگذاشت اجل با غم عشقم
من بودم و درد تو و دار اگہ خبر کرد

پوشید رخ خویش ز پوشیدہ نگاہم
او خود نشد آگاہ، حیا را کہ خبر کرد

ندانم از دل آسودہ ام دیگر چہ می خواہد
زبان زلف او با من سخن پیچیدہ می گوید

درین گلشن بدرد و عیش ہر کس قسمتی دارد
کہ بلبل مدعا نالیدہ گل خندیدہ می گوید

حرفی ز رنجش تو نمی گوئت از حسد
قاصد اگر بلذت دشنام می رسد

ہمتی تا فگنم طرح بہاری ز سر شک
رشک فرمای گلستان قفسی می خواہم

عہد آں روز کہ با زلف پریشاں بستم
طمع از خویش بریدم نظر از جاں بستم

ان منتخب اشعار کے مقابلہ میں بہت سے اشعار لفظ و معنی کے لحاظ سے بہت معمولی درجہ کے ہیں، اور ان میں تصنع، پیچیدگی اور معنی آفرینی زیادہ پائی جاتی ہے، مثلاً

مبادا حسن او برہم زند ہنگامۂ گل را
چو باد و سیر گل کردم گرفتم چشم بلبل را

بزیر خاک چناں گریم ابعش فطرت
کہ سبزہ روید باشبنم از مزار مرا

فطرت نے بہت سے قطعے کہے ہیں، جن میں سے کچھ بہت چھوٹی چھوٹی چیزوں کے متعلق بھی ہیں، ان قطعوں میں اس نے اپنے بھائی محمد بیگ المولود سنہ ۱۰۲۳ھ، کریم بیگ المولود سنہ ۱۰۳۰ھ اپنے لڑکے سنجر بیگ المولود سنہ ۱۰۲۵ھ، علی بیگ المولود سنہ ۱۰۴۵ھ، اپنے پوتے نصر بیگ المولود سنہ ۱۰۴۴ھ ابن سنجر بیگ، اپنے بھائی کے لڑکے مختار بیگ المولود سنہ ۱۰۳۴ھ ابن حمزہ بیگ، اپنے خالو کے لڑکے خواجہ میرک المولود سنہ ۱۰۴۹ھ، اور ان کے علاوہ اس نے باقر المولود سنہ ۱۰۲۷ھ، یوسف، مرزا صمصام الدولہ المولود سنہ ۱۰۳۹ھ، آقا رضا کی کنیز سے پیدا ہوئے بچہ میر معصوم المولود سنہ ۱۰۴۰ھ کسی اخوند کے غلام بچہ المولود سنہ ۱۰۴۱ھ، عبداللہ قطب شاہ کے لڑکے المولود سنہ ۱۰۴۲ھ، مرزا قاسم پسر مرزا ایرج المولود سنہ ۱۰۴۴ھ، مرزا تراب المولود سنہ ۱۰۴۵ھ پسر مرزا ایرج المولود سنہ ۱۰۴۵ھ میر یحیی، کسی بادشاہ زادہ المولود سنہ ۱۰۴۸ھ محمد محسن المولود سنہ ۱۰۵۰ھ، محمد صادق المولود سنہ ۱۰۳۵ھ احمد بیگ، پسر سید مرزا المولود سنہ ۱۰۴۶ھ، پسر مرزا احمد المولود سنہ ۱۰۵۶ھ، مرتضی بیگ المولود سنہ ۱۰۵۷ھ پسر مرزا ابراہیم سلیمان بیگ المولود سنہ ۱۰۵۷ھ، قزلباش خاں المولود سنہ ۱۰۵۸ھ، محمد کے بیٹے اور دو جڑواں مرزا مقیم المولود سنہ ۱۰۵۹ھ اور مرزا تراب المولود سنہ ۱۰۵۹ھ کی ولادت، اور اپنے بھائی محمد بیگ المتوفی سنہ ۱۰۴۵ھ حمزہ بیگ المتوفی سنہ ۱۰۳۳ھ، ہاشم بیگ، اپنے والد المتوفی سنہ ۱۰۴۰ھ، میر معصوم المتوفی سنہ ۱۰۲۲ھ میر ابو البقا المتوفی سنہ ۱۰۲۳ھ، کسی برخوردار المتوفی سنہ ۱۰۲۹ھ، خواجہ میرک المتوفی سنہ ۱۰۳۳ھ، شاہ عباس، مرتضی خاں المتوفی سنہ ۱۰۳۹ھ، میر محمد تقی الجزی المتوفی سنہ ۱۰۳۹ھ روزبہان شیرازی المتوفی سنہ ۱۰۴۱ھ احمد بیگ المتوفی سنہ ۱۰۴۲ھ، میر کاظم المتوفی سنہ ۱۰۴۳ھ، خان زماں المتوفی سنہ ۱۰۴۶ھ، فضلی بیگ المتوفی سنہ ۱۰۵۰ھ، نواب آصف خاں المتوفی سنہ ۱۰۵۰ھ، جہانگیر بادشاہ، پہلوان علی رومی اصفہانی المتوفی سنہ ۱۰۵۱ھ، مرزا خاں المتوفی سنہ ۱۰۵۴ھ اور خان دوران المتوفی سنہ ۱۰۵۵ھ کے وفات کی تاریخیں کہی ہیں،

ولادت و وفات کی تاریخوں کے علاوہ فطرت نے شاہ عباس کی شراب سے توبہ سنہ ۱۰۲۲ھ، ان کی فتح سنہ ۱۰۲۷ھ، بہادر خاں کے قندھار کے محل سنہ ۱۰۲۴ھ، مرزا نظام کے بھیجے ہوئے دیوان سنہ ۱۰۲۶ھ، طالب قورچی کی دوستی سنہ ۱۰۲۸ھ، امام قلی خاں کی جنگ، ہرمز میں بنائی ہوئی توپ سنہ ۱۰۳۱ھ اور مرصع صراحی سنہ ۱۰۳۶ھ، صفی قلی سلطان کے گھر سنہ ۱۰۳۷ھ، شاہ جہاں کے جلوس، ملک جلال الدین حاکم سیستان کی عمارت سنہ ۱۰۳۸ھ، مرتضی خاں کی عمارت سنہ ۱۰۳۸ھ، ملک سیستان سے گھوڑا خرید نے سنہ ۱۰۳۸ھ، عادل شاہ کے بیجاپور میں نہر لانے سنہ ۱۰۳۹ھ اعتماد خاں کے عزم جنگ سنہ ۱۰۳۹ھ، کسی کی کدخدائی سنہ ۱۰۴۰ھ مصطفی خاں کی عمارت سنہ ۱۰۴۰ھ، پرندہ قلعہ کی فتح، عادلشاہ اور قطب شاہ کے رشتہ سنہ ۱۰۴۰ھ انکے بیجاپور کے گھر سنہ ۱۰۴۱ھ، گھر کے دروازہ سنہ ۱۰۴۲ھ میر فصیح کے گولکنڈہ میں نئے عہدہ سنہ ۱۰۴۲ھ. قلعہ دولتاباد کی فتح سنہ ۱۰۴۳ھ، خان زماں کے ہاتھوں قلعہ جنید کی فتح سنہ ۱۰۴۶ھ، سنجر بیگ کے ہند آنے سنہ ۱۰۴۶ھ، اورنگزیب کی کدخدائی، قلعہ بگلانہ کی فتح سنہ ۱۰۴۸ھ، اورنگ زیب کے دولتخانہ کی عمارت سنہ ۱۰۴۹ھ، اپنی بنائی ہوئی مسجد سنہ ۱۰۴۹ھ، اپنے ولی نعمت کے ہند آنے سنہ ۱۰۵۰ھ، رشید کے حمام سنہ ۱۰۵۱ھ، عباس ثانی کے جلوس، اورنگ زیب کی مسجد سنہ ۱۰۵۲ھ کسی باغ سنہ ۱۰۳۵ھ، چیچک سے صحت سنہ ۱۰۳۵ھ کسی حمام سنہ ۱۰۳۶ھ، کسی گھر سنہ ۱۰۳۶ھ، ایک ہشت در عمارت سنہ ۱۰۳۶ھ. نئے کلانتر کے تقرر اور پرانے کی معزولی سنہ ۱۰۲۷ھ، محمد بیگ پسر سوہدک سلطان کی سنت سنہ ۱۰۳۶ھ ایک گبر کے اپنے ہاتھوں مسلمان ہونے سنہ ۱۰۳۶ھ، شاہ صفی کے جلوس، ایک مغل کے پیر ٹوٹنے، کئی کدخدائیوں، شاہ محمد خاتون کے منصب پانے سنہ ۱۰۴۳ھ، اپنے لشکر دکن پر شبخون مارنے سنہ ۱۰۴۴ھ، اورنگ زیب کے شکار کھیلنے سنہ ۱۰۴۷ھ، رشید خاں کے حمام سنہ ۱۰۵۱ھ، اپنے بیٹے علی بیگ کی سنت سنہ ۱۰۵۵ھ، اپنے باغ گلاب سنہ ۱۰۵۶ھ اور ایک

پانی کے مٹکے ۱۲۸۰ھ کی جسے کسی نے بھیجا تھا، تاریخیں کہی ہیں، ان کے علاوہ مختلف قطعات مختلف واقعات سے متعلق ہیں، فطرت کی رباعیاں زیادہ تر اخلاقی اور معمولی درجہ کی ہیں، ایک رباعی میں دلاک کا ذکر کیا گیا ہے:

دلاک ندانستہ وفا داری را | آئین وفا و رسم دلداری را
تیغش دو ہزار زخم بر من زدہ است | آموختہ از چرخ ستمگاری را

ایک رباعی میں خان زماں کے خلعت پانے کا ذکر ہے، اور ایک میں برسات میں اپنے ٹپکتے ہوئے گھر کی تصویر کشی کی ہے۔

اقبال کامل

ڈاکٹر اقبال کے فلسفہ و شاعری پر اگرچہ بکثرت مضامین، رسالے اور کتابیں لکھی گئیں، لیکن ان سے ان کی بلند پایہ شخصیت واضح اور مکمل طور پر نمایاں نہ ہو سکی، یہ کتاب اس کمی کو پورا کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، اس میں ان کے مفصل سوانح حیات کے علاوہ ان کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل لکھی گئی ہے، اور سوانح حیات کے بعد پہلے ان کی اردو شاعری پر، پھر فارسی شاعری پر ان کے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ مفصل تبصرہ کیا گیا ہے، اور ان کے کلام کی تمام ادبی خوبیاں دکھائی گئی ہیں، پھر ان کی شاعری کے اہم موضوعوں یعنی فلسفۂ خودی، فلسفۂ بیخودی، نظریۂ ملیت، تعلیم، سیاست، صنف لطیف (یعنی عورت) فنون لطیفہ اور نظام اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے۔

(زیر طبع)

(مرتبہ مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم)

ضخامت ۴۰۰ صفحے | قیمت چھ روپے

منیجر

ابو عثمان جاحظ

از جناب مولانا ضیاء الدین صاحب اصلاحی رفیق دار المصنفین

(۲)

لطافت و ظرافت جاحظ بڑا ظریف اور خوش طبع تھا، اکثر ظرافت اور دلچسپی کی باتیں کیا کرتا تھا اور اپنی ذہانت و طباعی سے عام باتوں میں بھی لطف و ندرت پیدا کر دیتا تھا، اس لیے اس کی کتابیں اور تحریریں دلآویزی اور دلکشی کا مرقع ہوتی ہیں، کبھی کبھی وہ سنجیدگی اور متانت کی باتیں بھی مذاق کے رنگ میں کرنے لگتا، اور سادہ پانی کو پر کیف شراب بنا دینا اس کا ادنیٰ کرشمہ تھا، حکمت و دانش کی باتیں کرتے کرتے ایسی دلچسپ باتیں شروع کر دیتا ہے کہ بیساختہ ہنسی آجاتی ہے، جس سے موضوع کی خشکی فرحت و انبساط میں بدل جاتی ہے۔

مسعودی لکھتا ہے کہ جاحظ کو پڑھنے والے کی اکتاہٹ اور سننے والے کی بیزاری کا احساس ہوتا ہے تو وہ سنجیدگی کی باتیں چھوڑ کر مذاق اور حکمت و تدبیر کے بجائے انوکھی اور دلچسپ باتیں کرنے لگتا ہے[1]، احمد فرید رفاعی لکھتے ہیں کہ ادب اور لطافت و ظرافت میں اس کی متعدد کتابیں ہیں، اور یہ اس کا کمال ہے کہ وہ دین کا امام[2] بھی سمجھا جاتا ہے اور ایک ماہر داستان گو[3] بھی، وہ اپنی خوش طبعی اور میٹھی میٹھی باتوں سے لوگوں کا دل موہ لیتا تھا، اور اس کی بدولت امراء و سلاطین سے بیش بہا ہدیے اور صلے حاصل کرتا تھا اور اپنے کو مشکلات و خطرات سے بھی بچا لیا کرتا تھا،[4]

---

[1] تاریخ مسعودی برحاشیہ کامل ابن اثیر ج ۹ ص ۲۲۹ [2] یہ بات صحیح نہیں ہے، جاحظ ایک امام اور عالم دین کی حیثیت سے کسی زمانہ میں بھی مشہور نہیں سمجھا گیا، زیادہ سے زیادہ اس کا شمار ائمۂ ادب و اعتزال میں ہوتا ہے [3] عصر المامون ج ۱ ص ۳۴۴ [4] ایضاً ص ۳۴۲

اس کی خوش مذاقی اور خوش طبعی کے بہت سے واقعات ہیں، چند نمونۃً نقل کیے جاتے ہیں،

ابو محمد حسن بن عمرو بخیرمی کا بیان ہے کہ جب میں اندلس میں مقیم تھا تو وہاں جاحظ کے ایک شاگرد کا مجھے پتہ چلا میں نے اس سے مل کر پوچھا کہ جاحظ تو یہاں کبھی نہیں آیا، پھر کس طرح تم اس کے شاگرد ہو گئے؟ اس نے بتایا کہ مشرق کے جو طالبین علم جاحظ سے مل کر ہمارے یہاں بادشاہوں کے پاس آتے تھے، ان کے ذریعہ ہمیں اس کی کتاب التربیع والتدویر اور پھر کتاب البیان والتبیین ملیں یہ دونوں کتابیں بہت خوب ہیں، مصنف کا کمال ان سے نمایاں تھا، اس لیے میں اس کی تلاش میں بغداد، سر من رای اور بصرہ گیا، بصرہ پہنچکر اس کے گھر گیا تو بیس طالب علموں کو اس کے پاس بیٹھے دیکھا، جن کے ابھی داڑھیاں بھی نہیں نکلی تھیں، پہلے تو مجھ پر ہیبت طاری ہوئی اور میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا، اس میں ابو عثمان کون ہے؟ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بلایا اور پوچھا کہاں سے آرہے ہو، میں نے کہا اندلس سے، اس نے کہا اچھا احمقوں کے وطن سے، پھر نام دریافت کیا، میں نے اپنا نام سلام بتایا، اس نے کہا یہ تو قراد کے کتے کا نام ہے، پھر باپ کا نام پوچھا، میں نے کہا یزید، اس نے کہا ٹھیک ہے، پھر کنیت پوچھی، میں نے ابو خلف بتائی، اس نے کہا یہ زبیدہ کے بندر کی کنیت ہے، اپنے آنے کا مطلب بتاؤ، میں نے عرض کیا علم کے شوق وجستجو میں آیا ہوں، جاحظ نے کہا، واپس جاؤ اس میں کامیابی نہ ہوگی، میں نے کہا آپ نے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا، مجھ میں چار خصوصیتیں پائی جاتی ہیں (۱) بعد وطن (۲) سفر کی مشقت وزحمت (۳) نوجوانی کی غفلت اور (۴) نو واردوں کی طرح خوف و دہشت کا غلبہ،

جاحظ نے کہا تم نے میرے پاس ۲۰ طالب علم دیکھے، میرے سوا ان میں سے کسی کی بھی مسیں ابھی نہیں بھیگی ہیں، ایسی حالت میں کیا تم مجھے پہچان نہیں سکتے تھے، اس کے بعد ۲۰ سال تک میں وہاں مقیم رہا،[1]

سوادبن ابو شراعہ کا بیان ہے کہ جب میں جاحظ کے پاس مقیم تھا تو اس نے مجھے ایک دن معمولی ردی کاغذ پر معمولی قلم سے گھنا اور قریب قریب لکھتے دیکھا تو کہا شاید تمہیں اپنے ورثہ سے محبت نہیں ہے، میں نے پوچھا وہ کیسے؟ اس نے جواب دیا اس لیے کہ تم ان کے لیے اچھا سرمایہ نہیں جمع کر رہے ہو۔[2]

علی بن قاسم ادیب کا بیان ہے کہ میرے ایک دوست نے جاحظ سے اسکی حالت دریافت کی، اس نے کہا تم نے اس سوال میں کئی باتیں دریافت کی ہیں، ہر ایک کا جواب سنو! میری حالت یہ ہے کہ وزیر میری رائے اور مشورے سے فیصلہ کرتا ہے، خلیفہ انعام واکرام میں مجھے ترجیح دیتا ہے، میں عمدہ اور فربہ طیور کا گوشت کھاتا ہوں، نرم ونازک لباس پہنتا ہوں، اور طبرستانی ملائم فرش پر بیٹھتا ہوں، اور بہترین تکیہ سے ٹیک لگاتا ہوں، یہ حالت اس وقت تک رہے گی جب تک اللہ تعالیٰ میرے لیے آسایش نہ مہیا کر دے، میرے دوست نے سوال کیا کیا یہ عیش و فراغت کی حالت نہیں ہے، اس نے جواب دیا نہیں، میری خواہش یہ ہے کہ مجھے خلافت ملے، اور محمد بن عبد الملک میرے حکم کی تعمیل کرے اور میری خدمت میں حاضر رہے، جب ایسا ہو جائے گا تب آسایش اور فراغت نصیب ہوگی،[3]

ابو العیناء بیان کرتے ہیں کہ جاحظ محمد بن عبد الملک زیات کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا جب فالودے کا دور آیا تو محمد نے بطور تفنن جاحظ کے سامنے اس کا ہلکا اور رقیق پیالہ رکھوایا، جاحظ نے فوراً اس کو پی لیا، ابن زیات نے کہا تمہارا پیالہ سب سے پہلے چھٹ گیا، جاحظ نے کہا اس لیے کہ اس میں سب سے کم اور ہلکا پانی تھا،[4]

۱؎ معجم الادباء ج ۶ ص ۷۴، ۷۵، ۲؎ امالی سید مرتضیٰ ج اول ص ۱۴۰، ۳؎ تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۲۱۸ و ۲۱۹
۴؎ ایضاً ص ۲۱۷ و ۲۱۸ و نزہتہ الالباء ص ۲۵۶ و ۲۵۷

جاحظ اپنی طلاقت لسانی اور چرب زبانی سے بھی بڑی لطیف اور نازک خیالی کی باتیں کرتا، اور خود بھی محظوظ ہوتا اور دوسروں کو بھی محظوظ کرتا۔

اس کی کتابوں میں بھی مزاح اور ظرافت کی بڑی چاشنی ہے، اور اس کے بڑے دلچسپ واقعات ہیں، وہ لکھتا ہے کہ ایک مرتبہ اس نے بنی حزام کے ایک آدمی سے پوچھا تمھیں یہ پسند ہے کہ لوگ تم کو بخیل کہیں، اس نے جواب دیا، اللہ تعالیٰ مجھ سے یہ نام زائل نہ کرے، جس شخص کو بخیل کہا جاتا ہے وہ مالدار ہوتا ہے، اگر مجھے مالدار تسلیم کر لیا جائے تو پھر جو چاہے نام دیا جائے، مجھے اسکی پروا نہیں، میں نے کہا کہ سخی بھی تو مالدار ہی کو کہتے ہیں، اور سخاوت کا لفظ تعریف و توصیف پر مشتمل ہے، اور بخل میں مذمت پائی جاتی ہے، حزامی نے کہا ان دونوں لفظوں میں فرق ہے، بخیل مالدار ہونے کے ساتھ محتاط اور صاحب حزم و تدبر بھی ہوتا ہے، گو وہ مذموم سمجھا جاتا ہے، اور سخاوت نام ہے مال کی ضیاع و بربادی کا، گو اسے محمود وصف مانا جاتا ہے، درحقیقت مال نفع بخش چیز ہے، اس سے صاحب مال کا اعزاز و اکرام ہوتا ہے، گو اس کی تعریف و توصیف کھوکھلی ہوتی ہے، اور مذاق و تمسخر سے زیادہ اس کی اہمیت نہیں ہوتی، اور جس کی تعریف کیجاتی ہے، اس پر اضمحلال اور افسردگی طاری ہو جاتی ہے اور اس کی حرکت و نشاط ختم ہو جاتا ہے۔ (کتاب البخلاء)

اس طرح کے اور بھی واقعات ملتے ہیں، جس سے اسکی ظریفانہ طبیعت کا پتہ چلتا ہے،

عقیدہ و مذہب | جاحظ نہ صرف معتزلی بلکہ فرقہ معتزلہ کے سرخیل علاف کے مشہور و مایہ ناز شاگرد نظام کا خانہ زاد غلام و شاگرد، معتزلہ کا امام و ترجمان اور ان کے ایک فرقہ کا بانی بھی تھا، جو اس کی نسبت سے جاحظیہ کہلاتا تھا، اس نے اپنی تحریروں میں معتزلہ کی پوری تائید و حمایت کی ہے، اور چونکہ قدرت نے اس کو زور بیان اور قوت استدلال عطا کیا تھا، اس لیے اس کی کتابوں سے مذہب اعتزال کو بڑی تقویت حاصل ہوئی، مگر اعتزال کی وجہ سے خود اس کے عقائد بڑے نا

تھے اور اس کی جانب مختلف بدعتیں اور گمراہیاں منسوب کی جاتی ہیں اور اس کے عقیدہ میں بڑا فتور بتایا جاتا ہے[1]، اس کے ضبط و ثقاہت میں بھی کلام کیا گیا ہے، علامہ ابن کثیر نے اسے سیئی المخبر بتایا ہے[2]، ثعلب کا بیان ہے کہ وہ ثقہ اور قابل اعتبار نہیں[3]، ابو العباس احمد بن یحییٰ کی مجلس میں جاحظ کا ذکر چھڑا تو انھوں نے کہا کہ اس کا تذکرہ نہ کرو، وہ غیر ثقہ اور ناقابل اعتبار ہے[4]، ازہری کا قول ہے کہ وہ ثقہ اور معتبر لوگوں کی طرف غلط چیزیں منسوب کرتا ہے[5]۔ اس کی طلاقت لسانی، نادر الکلامی اور مختلف علوم و فنون میں مہارت و جامعیت کے باوجود اہل علم نے اس کی مذمت کی ہے، اور اس کی صداقت میں کلام کیا ہے[6]۔ عبد القاہر بغدادی نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے:

ولو عرفوا جهالاته في ضلالاته	اگر لوگ اس کی گمراہ کن جہالتوں سے
لاستغفروا الله تعالى من	واقف ہو جائیں تو اسے انسان کہنے
تسميتهم انسانا فضلا عن	بھی خدا کی پناہ مانگنے لگیں، چہ جائے کہ
ان ينسبوه اليه احسانا[7]	اسکی طرف کسی فضل و احسان کو منسوب کریں۔

ان بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ معتزلہ اور جاحظ کے متعلق دیندار علماء کے خیالات کس قدر سخت تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ معتزلہ کے تمام عقائد باطل ہیں اور نہ جاحظ کا عقیدہ اس قدر گمراہ کن ہے، ..... اس کے خاص خاص عقائد .... حسب ذیل ہیں:۔

(۱) تمام معارف طبعی حقیقۃً آدمی کے افعال ہیں جو اس سے طبعاً اور غیر اختیاری طور پر صادر ہوتے ہیں، اس لیے اس کی جانب منسوب ہوتے ہیں، آدمی کا کسب و عمل صرف ارادہ ہے اور

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۱۱۹ [2] ایضاً [3] شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۲۱ [4] حاشیہ کتاب الامالی جلد اول ص ۱۳۹ [5] ایضاً [6] ایضاً
[7] الفرق بین الفرق ص ۱۶۰

اسی سے افعال واجبی ہوتے ہیں، جاحظ کے نزدیک کسی شخص کا اللہ تعالیٰ کی معرفت سے محروم ہوجانا ناممکن ہے، اس کے خیال میں کفار بربنائے عناد اور جان بوجھ کر کفر و انکار اختیار کرتے ہیں، ان کی عصبیت اور اپنے مذہب سے شدید گرویدگی انھیں معرفتِ حق سے باز اور اپنے مذہب کے خلاف کوئی بات قبول کرنے پر آمادہ نہیں کرتی،

(۲) حدوث کے بعد اجسام کا معدوم ہوجانا محال ہے، کیونکہ ان کا تعلق جواہر سے ہے اور جواہر فنا نہیں ہوتے، البتہ اعراض میں تغیر و تبدل ہوتا ہے،

(۳) اللہ تعالیٰ لوگوں کو دوزخ میں نہیں ڈالے گا، بلکہ جہنم کی خاصیت اور طبیعت ہی ایسی ہے کہ وہ اہل نار کو اپنی جانب کھینچ لے گی، اس لیے وہ خود بخود اس میں چلے جائیں گے[۱]،

ان کے علاوہ بعض اور فاسد خیالات بھی انکی طرف منسوب کیے گئے ہیں، جو فلاسفہ اور یونانی حکماء کے افکار سے ماخوذ ہیں، اور جن کے گمراہ کن و باطل ہونے میں کوئی شبہ نہیں، عبدالقاہر بغدادی وغیرہ نے ان کا رد لکھا ہے، لیکن خیاط معتزلی نے اپنی کتاب الانتصار والرد علی ابن الراوندی میں جاحظ کا دفاع کرتے ہوئے انکے خیالات میں سے بعض کی نسبت کو اس کی جانب غلط قرار دیا ہے، اور ان کو سراسر کذب و افترا بتایا ہے، کیونکہ نہ اس کی کتابوں سے ان کی کوئی تائید ہوتی ہے اور نہ اس کے اصحاب نے ان کی روایت کی ہے، اور نہ اس کے ہم مذہب اور ہم مذاق لوگوں نے اس کا یہ مذہب بتایا ہے، اس کے برعکس جن لوگوں کو ردِ تشبیہ یا سیر و اخبار، اثباتِ رسالت اور نظم قرآن وغیرہ کے متعلق اس کی کتابیں دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ اس کے اسلامی خدمات سے واقف ہیں، اور اللہ تعالیٰ ان خدمات کو ضائع نہیں کرے گا[۲]،

یہ تو تسلیم ہے کہ معتزلہ اور جاحظ کے بعض عقائد و اعمال غلط اور گمراہ ہیں، لیکن اس بارہ میں

---

[۱] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو الملل والنحل شہرستانی برحاشیہ الملل والنحل ابن حزم ج اول ص ۹۴ و ۹۵ و الفرق بین الفرق ص ۱۷۰ و ۱۷۱، [۲] کتاب الانتصار والرد علی ابن الراوندی ص ۲۱ و ۲۲

جس قدر غلو کیا گیا ہے وہ بھی افسوس ناک ہے،

جاحظ کا حلیہ

جاحظ نہایت بدشکل اور اپنی بدصورتی کے لیے مشہور تھا، علامہ ابن خلکان بیان کرتے ہیں کہ وہ اپنے فضائل اور کمالات کے باوجود بدشکل اور قبیح المنظر تھا، اور اسے جاحظ کہے جانے کا سبب یہ تھا کہ اس کی دونوں آنکھیں اٹھی اور ابھری ہوئی تھیں، اور اسی بنا پر اسے حدقی بھی کہا جاتا ہے[۱]، وہ خود بیان کرتا ہے کہ خلیفہ متوکل کو اپنے لڑکوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک استاد کی ضرورت ہوئی، تو اس نے مجھے طلب کیا اور میری بھیانک اور کریہہ صورت دیکھکر انعام و اکرام دیکر واپس کردیا[۲]،

اس کی بدصورتی کے متعلق محاضرات کی کتابوں میں ایک لطیفہ ملتا ہے، کہ ایک مرتبہ ایک عورت جاحظ کو بلاکر ایک مصور کی دکان پر لے گئی، اور اس سے کہا کہ اسی طرح بنا دو، یہ کہکر لوٹ گئی، جاحظ نے مصور سے پوچھا کہ اس کے کہنے کا کیا مقصد تھا، مصور نے کہا کہ اس عورت نے مجھ سے شیطان کی تصویر بنانے کی فرمائش کی تھی، میں نے اس سے کہا کہ میں نے کبھی اس کو دیکھا ہی نہیں، اس کی تصویر کس طرح بنادوں، اس پر اس نے تم کو لاکر تمھاری صورت دکھادی،

اخلاق و عادات

جاحظ طبعاً نیک سیرت اور عادات و اخلاق میں بلند تھا، ہر شخص سے حسن سلوک اور نرمی سے پیش آتا تھا، ہمیشہ ہنسی مذاق، لطف و تفریح اور ظرافت و خوش طبعی کی باتیں کرتا تھا، اس کی کتابوں اور اقوال سے بھی اس کی شرافت، رحمدلی اور کریمانہ اخلاق کا ثبوت ملتا ہے، اور اس نے اخلاق و آداب کے موضوع پر کئی کتابیں بھی لکھی ہیں[۳]، اس کی رواداری اور بےتعصبی کا یہ حال تھا کہ ہر خیال کے علماء و فضلاء، اور ہر طبقہ کے اصحاب علم و فن سے ملتا تھا، اور متعصب اور تنگ نظر لوگوں کی طرح نہ تو کوئی امتیاز برتتا تھا[۴] اور نہ غلط قسم کی مذہبی، قومی اور نسلی عصبیتوں میں مبتلا تھا، وہ بڑا روادار، فیاض اور سیر چشم تھا، اسکی مجلس بڑی دلچسپ ہوتی تھی، اور وہ نہایت خوش مذاق اور شیریں سخن تھا[۵]،

---

[۱] تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۱۰۸، [۲] ایضاً و شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۲۱ و ۱۲۲، [۳] معجم الادباء ج ۶ ص ۷۵، [۴] ضحی الاسلام ج اول ص ۳۰۸، [۵] عصر المامون ج اول ص ۴۲۲ و ۴۲۳

عام طور سے لوگ اپنی زندگی کے ایسے واقعات نہیں بیان کرتے جن سے ان کی سبکی ہوتی ہو، اور اگر دوسرے لوگ اس کے متعلق اس طرح کے واقعات بیان کرتے ہیں تو وہ انھیں سخت ناگوار ہوتا ہے، مگر جاحظ انھیں بھی بلاتکلف بیان کر دیتا تھا، اور اس میں اس کو شرم محسوس نہیں ہوتی تھی۔[1]

علالت اور وفات جاحظ نے طویل عمر پائی، آخر عمر میں پیر اسقدر ضعف طاری ہوگیا تھا کہ اعضاء و جوارح نے بالکل جواب دیدیا تھا، فالج کا بھی حملہ ہوا تھا، اور آئے دن طرح طرح کے عارضوں اور تکلیفوں میں مبتلا رہتا تھا، اسکے مثانہ میں پتھری ہوگئی تھی، اس زندگی سے وہ تنگ آگیا تھا، شدت درد و الم سے ہر وقت اسکی زبان پر آہ و شیون کے کلمات جاری رہتے تھے، مبرد کا بیان ہے کہ آخر عمر میں جب جاحظ سخت بیمار تھا تو میں اس کو دیکھنے کے لیے اس کے گھر گیا، اس نے کہا ایسے شخص کا کیا حال پوچھتے ہو جس کا آدھا جسم اس طرح مفلوج ہوگیا ہے کہ اگر اسے آرے سے چیر دیا جائے اور قینچیوں سے کاٹ دیا جائے تو بھی اسکو اس کا احساس نہ ہوگا، جسم کے دوسرے نصف حصہ میں اس قدر تکلیف اور درد ہے کہ اگر مکھی بھی اس کے قریب سے گذرتی ہے تو اسکو اذیت محسوس ہونے لگتی ہے،[2] اس حالت میں اکثر یہ اشعار پڑھا کرتا تھا:۔

اترجوان تکون وانت شیخ	کما قد کنت ایام الشباب
لقد کذ بتک نفسک لیس ثوب	دریس کالجدید من الثیاب[3]

کیا تمھیں عالم پیری میں بھی اس کی توقع ہے کہ تم زمانۂ شباب کی طرح (تندرست و توانا) ہو جاؤ گے ہرگز نہیں، تمھارا نفس تمھیں فریب دیتا ہے، کوئی پرانا کپڑا نئے کپڑے کی طرح نہیں ہو سکتا،

جسم کی سوزش اور حرارت سے پریشان ہو کر نصف جسم پر صندل اور کافور کا لیپ لگاتا تھا اور نصف جسم اس قدر ٹھنڈا تھا کہ اگر کاٹ بھی ڈالا جاتا تو اسے خبر نہ ہوتی،[4]

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۲ [2] تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۱۱۰ و تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۲۱۹ و امالی ج اول ص ۱۴۲ [3] ایضاً [4] تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۱۱۰ و مرأۃ الجنان ج ۲ ص ۱۶۴

اپنے معالج سے شکایت کیا کرتا تھا کہ میرے جسم میں دو عجیب اور متضاد خصوصیات جمع ہوگئی ہیں، اگر کوئی ٹھنڈی چیز کھاتا ہوں تو پیروں میں تکلیف ہوتی ہے اور گرم چیز کھاتا ہوں تو سر میں تکلیف بڑھ جاتی ہے۔[1]

احمد بن عمر بر ذعی متکلم کا بیان ہے کہ میں جاحظ سے ملاقات کے لیے اس کے گھر گیا، اور اندر جانے کی اجازت چاہی تو ایک شخص نے باہر آکر کہا کہ وہ کہہ رہا ہے

ماتضع بشق مائل ولعاب
سائل[2]

تم کو ایک ایسے شخص سے کیا کام اور روا ہے جسکی کمر ٹیڑھی اور منہ سے لعاب جاری ہے،

اسی طرح امیر المومنین متوکل نے اسے بصرہ سے بلانا چاہا تو اس نے کہلایا کہ امیر المومنین ایسے بے کار شخص کو کیا کریں گے جس کی کمر جھک گئی ہے، منہ سے لعاب جاری رہتا ہے، عقل میں فتور آگیا ہے اور رنگ تبدیل ہو چکا ہے،[3]

اسی حالت میں آخر ۲۵۵ھ میں وفات پائی، بعض تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ اس کی وفات اس کے اوپر کچھ کتابوں کے گر جانے کی وجہ سے ہوگئی تھی۔[4]

(باقی)

---

[1] امالی ج اول ص ۲۴۱ و معجم الادباء ج ۶ ص ۸۰ [2] امالی ج اول ص ۲۴۱ و ابن خلکان ج ۲ ص ۱۱۰ و معجم الادباء ج ۶ ص ۸۰ [3] امالی ج اول ص ۲۴۱ [4] شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۲۲ و تاریخ ابوالفداء ج ۲ ص ۴۷ و اعلام ج ۲ ص ۴۲۹

آثار علمیہ و ادبیہ

مکاتیب مولانا مناظر احسن گیلانیؒ

بنام

مولانا سید سلیمان ندویؒ

۱۰ر نومبر ۱۹۴۴ء

سیدی الکریم العلامہ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

سخت رنج و انتشار کے ساتھ آپ کو یہ خبر دے رہا ہوں کہ ہمارے مولانا عبد الباری صاحب دمہ سے اچھے ہونے کے بعد اچانک بلڈ پریشر کی شکایت میں مبتلا ہوئے، میں گلبرگہ شریف خطابت کے سلسلہ میں گیا ہوا تھا، واپسی پر معلوم ہوا کہ اسی کے بعد ان کے دل پر چند حملے ہوئے۔ وہی حملے جو بلڈ پریشر والوں پر ہوتے تھے، پہلے تو صرف دوران سر ہی کی شکایت محسوس ہوئی، وہی شکایت جو آپ کے سامنے بھی ان کو ہوئی تھی، جس دن گلبرگہ شریف سے میں واپس ہوا، اسی دن مولانا رخصت بیماری لے کر لکھنؤ تشریف لے جا رہے تھے۔ اللہ رحم فرمائے۔

آج آپ کی خدمت میں اپنی کتاب "تدوین فقہ" کا ایک ابتدائی حصہ جو بصورت مقالہ ہمارے یہاں کے ریسرچ جرنل میں چھپا ہے، بھیج رہا ہوں، چاہتا ہوں کہ غریبوں کی کتابوں کے پڑھنے کی زحمت آپ حضرات بھلا کہاں برداشت کریں گے، لیکن سرسری نظر جیسے خاک کے

دوسرے خرافات پر ڈال دی جاتی ہے، خدا کے لیے اس نظر سے بھی اسے محروم نہ فرمائیں، آپ کی رائے اور خیال کا انتظار رہے گا، ماجد میاں کو تو مدت ہوئی پہلے ہی بھیجا تھا، لیکن غالباً پسند نہ آیا۔ کوئی خاص چیز جواب میں نہ آئی، البتہ مولانا عبد الباری صاحب نے بڑی ہمت افزائی فرمائی، اسی قسم کی جیسے جناب والا نے "الدین القیم" کے متعلق فرمائی ہے، معارف میں جو نوٹ اس کتاب پر شائع ہوا ہے، بڑی دیر میں ملا، "معارف" کے سراق آجکل پیدا ہو گئے ہیں، نہ مولانا عبد الباری ہی کو پرچہ ملا، اور نہ مجھے، صدق میں مجذوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر آپ کے مقالہ کا ذکر چھپا تھا، اسی کے بعد اس کی تلاش شروع ہوئی، کالج سے بھی کوئی صاحب لے گئے تھے، اب کل انشاء اللہ اسکے پڑھنے کا موقعہ ملے گا۔

مجھے اس کی آپ سے شکایت رہے گی کہ تعلیم و تربیت والی کتاب کی طرف آپ نے توجہ نہ فرمائی، مولویوں کی طرف سے وکالت کا حق افسوس ہے کہ اس میں خواہ مخواہ میں نے ادا کیا مجھے کیا معلوم تھا کہ اپنے مخالفین کی تو خیر موافقین کی بھی کتابیں یہ نہیں پڑھتے، کتنے قدیم اوہام باطلہ جو عہد جدید کی پیداوار تھے، ان کا ذکر کیا گیا، لیکن شاید کسی مولوی نے نہیں دیکھا، ایک مولوی صاحب کا صرف پنجاب سے خط آیا ہے کہ نحو و صرف میں تو نے جن چند مختصر رسالوں کو کافی قرار دیا ہے، یہ کیا غضب کیا ہے؟ بس اس کے سوا اور کوئی بات کسی نے پوچھی بھی نہیں، ہاں! انگریزی خوانوں میں سے صرف افضال قادری صاحب مسلم لیگ کے شعبۂ تعلیمی کے سکریٹری ان کا ایک مفصل خط موافقت میں آیا تھا، بہر حال میری یہ غرض قطعاً نہیں ہے کہ آپ لوگ میری مداحی فرمائیں، لیکن میرا تو یہ بجا حق ہے کہ جس طرح آپ لوگوں کی کتابیں میں لفظ بلفظ، حرف حرف پڑھتا رہا ہوں، آپ بھی کیوں نہیں میری کتابوں کو پڑھیں گے، فرض نہیں تو کم از کم قرض ہی سمجھ کر اس بار کو اتاریں، میں جانتا ہوں کہ جتنا نفع آپ حضرات کی کتابوں سے

خاکسار کو پہنچا ہے، میری کتابوں سے ظاہر ہے یہ نسبت آپ حضرات کو پیدا نہیں ہو سکتی لیکن پڑھنے میں کیا حرج تھا، کیا یہ بھی کوئی گناہ ہے،

شیخ اکبر کے نظریۂ علم کے مقالہ کا انجام کیا ہوا، اسلامی معاشیات کی آخری قسط بھی سیاست میں شائع ہو گئی، لیکن میں اسے اس لیے نہیں بھیج رہا ہوں کہ گذشتہ اقساط ہی کے لیے معارف میں جگہ نہ نکلی تو آئندہ کے لیے کیا نکلے گی۔

اس میں شک نہیں کہ معارف کی بدولت اس مضمون کو لوگوں نے کثرت سے پڑھا، مجھے اس پر حیرت ہوئی، اور علم میں اضافہ بھی ہوا، کہ آپ کے پرانے عنایت فرما امین صاحب زبیری مورخ بھوپال اسی مضمون سے متاثر ہو کر مجھ سے ملے، مگر ان کے متعلق میرا جو خیال تھا، وہ برعکس ثابت ہوا، میں نے ان کی مشہور شائع کردہ کتاب خطوط شبلی نہیں دیکھی تھی، نام سنا تھا، مجھے وہ دکھائی گئی، خطوط میں تو خیر کچھ نہ تھا، لیکن مولوی عبد الحق صاحب پر تعجب ہوا، افسوس! دل کی تربیت جب تک نہ ہو تو صرف دماغ کو روشن کر کے آدمی نہ خود نفع حاصل کر سکتا ہے نہ پہنچا سکتا ہے۔ زبیری نے ایک پرانا دکھڑا اپنا شروع کیا، آپ پر، شیروانی صاحب پر، اکرام اللہ خاں پر سب پر ان کے دعاوی دائر تھے، ہاں بیچارے شیروانی صاحب پر تو مکاتیب کے شروع میں بھی حملہ کیا گیا ہے، مجھے بڑا افسوس ہوا کہ زبردستی مولوی عبد الحق صاحب نے اپنے خیالات کو مولوی شبلی صاحب مرحوم کے الفاظ میں بھر کر ان کے کردار کو داغدار بنانے کی نامبارک کوشش کی ہے، میں اس قصہ سے بالکل ناواقف تھا، زبیری صاحب کے آپ کی حیات شبلی پر بھی بڑے بڑے دعوے ہیں، دھمکا رہے تھے کہ میدان میں میں بھی اترتا ہوں، حجت کر رہے تھے کہ میرے حوالے سے اس کتاب کے اندر جب واقعات درج کیے گئے ہیں تو اب ذمہ داری مجھ پر بھی عائد

ہوتی ہے، حقائق کا انکشاف کروں گا، بڑی تلخی گفتگو میں تھی، توبہ توبہ، استغفر اللہ،

میرا ایک مختصر سا مضمون "جدید خارجیت" کے عنوان سے صدق میں نکلا تھا، آپ نے کاہے کو پڑھا ہو گا، اس میں مشرقی اور عبد الوحید خاں کے ساتھ ساتھ حماقت یہ ہوئی کہ مودودی صاحب کی طرف بھی ذرا سخت لہجہ میں روئے سخن نام کی صراحت سے ہو گیا، مسلسل لعنت و ملامت کی بارش مجھ پر ہو رہی ہے، ان کے معتقدوں میں ہل چل مچی ہوئی ہے، مجھے حاسد قرار دیا جا رہا ہے، خود مودودی صاحب کا بھی گرامی نامہ آیا تھا، جس کا جواب ان کو دیدیا ہے،

نیاز مند

مناظر احسن گیلانی

۷ر دسمبر ۱۹۴۴ء

دار الجامعۃ العثمانیہ

حیدر آباد دکن

سیدی و سید الہند ادام اللہ عزکم السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

گرامی نامہ سامی کئی دن ہوئے کہ موجب فرحت و انبساط ہوا، گو تھوڑی سی اس کی تکلیف بھی ہوئی کہ آپ کے قیمتی وقت کو بلا وجہ میں نے گویا ضائع کیا، آپ کی تحریر کا ہر لفظ جو قیمت رکھتا ہے اور اس کے بعد ان دو طویل اوراق کے خط کو دیکھتا ہوں تو خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مجھ جیسے جہول و ظلوم، ذلیل و ذلول کے ساتھ حق تعالیٰ کی نوازش بے سبب کے سوا اور کیا ہے۔

الحمد للہ اس وقت تک حیدر آباد اپنے تمام خصوصیات کے ساتھ اسی حال میں ہے جس حال میں چھوڑ کر آپ گئے تھے، اس بشارت سے کہ مدراس کا قصد ہے، اور سفر مدراس کے سلسلہ میں حیدر آباد بھی سرفراز کیا جائے گا، فقیر کو خصوصاً اور جن جن جاننے والوں سے ذکر آیا، بڑی مسرت ہوئی، بلکہ جواب میں تاخیر کی وجہ آپ کی یہی بشارت ہوئی، آپ نے دریافت فرمایا تھا کہ تو ان دنوں میں کہاں رہو گا،

واقعہ یہ ہے کہ وہی زمانہ ہماری سرمائی تعطیل کا ہے، عام طور پر "من ودن تخلفت" فقیر ہر دو تعطیلوں میں گیلانی بیت
کی حاضری ضرور دیتا ہے، لیکن اکی سال یہ اتفاقی صورت پیش آگئی ہے کہ سرمائی تعطیل کی مدت کل
۹ دن کی ہے، اسی میں آمد بھی اور اسی میں رفت کی طویل مدت بھی شریک ہے، مسئلہ قابل بحث
ہوگیا، میں نے مکارم سلمۂ کو گیلانی اس حادثہ کی خبر دی تھی، اور لکھدیا تھا کہ اس سال ایک ٹال جانے کا
ارادہ ہے لیکن بعض خانگی ضرورتوں کی وجہ سے انتظار تھا، اس کے بعد آخری رائے قائم کروں گا،
مگر میاں مکارم کا آج تک جواب نہیں آیا، مجبوراً طے کرلیا ہے کہ اس سال سرما کا یہ موسم حیدرآباد
ہی میں بسر کروں گا، انشاء اللہ اس صورت میں بہرحال حیدرآباد ہی میں رہوں گا، خواہ جناب والا
کی تشریف آوری آمد میں ہو یا رفت کے وقت لیکن ایک پھیرا ہونا ضرور چاہیے، اور قیام کے متعلق
کیسے جرأت کروں، آپکے میزبان جب بنجارہ ہل پر بھی پائے جاتے ہیں تو سیتا پھل منڈی کے فقیر
کے جھونپڑے کو کون پوچھتا ہے، لیکن کلاہ گوشۂ دہقاں تو خود آسمان تک نہیں پہنچ سکتی جو پہنچا سکتا
ہے کاش اسے پہنچانے کا خیال آجائے،

مولانا عبدالباری صاحب کے افاقہ کا حال دوسرے ذرائع سے بھی معلوم ہو رہا ہے، اپنی رخصت
کی توسیع سرمائی تعطیل تک انھوں نے کرالی ہے، اب نوکری وہ چھوڑیں گے کیا نوکری بیچارے کو خود
چھوڑ رہی ہے، بلکہ یہ مسئلہ موجودہ حالت میں مولوی صاحب کی تشویش کا سبب بنا ہوا ہے، بڑھاپے
میں اہل و عیال والے ہوئے ہیں، جب زیادہ آمدنی کی ضرورت ہوتی ہے، اسی وقت آمدنی کا یکایک
غیر معمولی حد تک کم ہوجانا موجب فکر ہی ہو سکتا ہے، کوئی کوشش اس سلسلہ میں انھوں نے ممکنہ
حد تک اٹھا بھی نہ رکھی، لیکن اب تک اوپر کی منظوری نہیں ہوئی ہے، حق تعالیٰ فضل فرمائے،

مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ من حیث لا یدری طور پر مولانا کا دماغ اس واقعہ کے احساس سے متاثر ہے،
بلڈ پریشر کا جدید مرض کی شکل میں ان پر حملہ کرنا بلا وجہ نہیں ہے، دماغ پر کہتے ہیں کہ زیادہ اثر ہے۔

اور کیا عرض کروں، الدین القیم پر جناب والا کی رائے معارف والی پڑھی، "صوفیانہ علم کلام" نام
اپنے خوب رکھا، مجھے اس کا افسوس ہے کہ اپنے فطری "استھانی رنگ" کے خوف سے پنسل برداشتہ والے
اس مسودہ کو اسی اجمال و اختصار کی حالت میں شائع کرانا پڑا، اہل بصیرت تو اندازہ کرلیتے ہیں
لیکن عوام بیچاروں کو اس کا صحیح اندازہ لگانا کہ کن کن مسائل میں نئی راہیں اختیار کی گئی ہیں، ذرا مشکل ہے،
گو بعضوں نے اعتراف کیا ہے کہ تقریباً کتاب کے دوثلث مسائل ایسے ہیں، جن کے دعاوی تو ٹھیٹ
قرآن و حدیث سے ماخوذ ہیں لیکن استدلال میں کسی کی تقلید نہیں کی گئی ہے، لیکن بات آپ نے
صحیح لکھی کہ متکلمین سے ہٹ کر درحقیقت حضرات صوفیہ کی دلربائی کا یہ نتیجہ ہے، میرے پیش رو
اس راہ میں شیخ اکبر اور مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ ہیں، کہیں کہیں اپنی اپج بھی ہے، آپ نے
حدیث کنز پر جس کھٹکے کا اظہار فرمایا ہے صحیح ہے، لیکن فقیر نے ملا علی قاری کے اس بیان پر اس مسئلہ
میں بھروسہ کیا ہے کہ "معناہ صحیح" میرے نزدیک بھی واقعہ یہی ہے، موضوعات علی قاری میں ملاحظہ
فرمایا جائے، روایت تو مشکوٰۃ میں بھی موجود ہے، باقی "ولا الضالین" کی تفسیر پر آپ کا یہ اعتراض
کہ نص کے خلاف ہے، اس کا جواب تو اسی مضمون کے ذیل میں دیتا چلا گیا ہوں، غور فرمایا جاتا
تو شاید اس کا اندازہ فرما لیا جاتا کہ بخاری کی اس تفسیر سے غفلت نہیں برتی گئی ہے (ملاحظہ ہو ص۲۱)
الدین القیم کے یہ الفاظ کہ یہود مدینہ کو تجربات کے جو مواقع میسر آئے وہ عموماً نصاریٰ کو حاصل نہ تھے،
اس لیے اگر بخاری میں عہد نبوت کے ان دو فرقوں میں سے ایک کو مغضوب علیہم اور دوسرے کو
"الضالین" کے تحت داخل کیا گیا تو ان الفاظ کی یہ ایک اچھی توضیحی مثال ہو سکتی ہے،

یہ آپ نے خوب لکھا ہے کہ میں مینہ برسا رہا ہوں، سچ عرض کرتا ہوں، لکھنے کے لیے فقیر نے
اب تک خود کچھ نہیں لکھا ہے جو کچھ بھی ہو جاتا ہے، کوئی سر پر سوار ہو کر لکھوا لیتا ہے، یا اسی قسم
کی کچھ مجبوریاں پیش آجاتی ہیں، باقی آپ کا اس سے استکراہ خدا کرے بڑھتا جائے تاکہ اجرت میں

اضافہ جس حد تک نفس کی لذت اس میں شریک ہو گئی ہیں، فقط

نیازمند مناظر احسن گیلانی

"کتاب تعلیم وتربیت" پر آپ ہی کچھ ارقام فرمائیں گے یا کسی سے لکھوائیے گا، بہرحال مجھے پہلے ہی سے معلوم ہے کہ

ایسی ضد کا کیا ٹھکانا اپنا مذہب چھوڑ کر
ہم ہوئے کافر تو وہ کافر مسلمان ہو گیا

لیکن آج نہیں تو کل کرنا مسلمانوں کو وہی پڑے گا انشاء اللہ جو آج کہلایا گیا ہے، وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

۲؍ ذیقعدہ ۱۳۶۲ھ (۱۹۴۳ء)

سیدی وسید المسلمین اطال اللہ بقاکم ومتعنا والمسلمین بطول حیاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ ملفوف گرامی نامہ کئی دن پہلے ہی مل چکا تھا، جواب بھی اس کا لکھ چکا تھا کہ کارڈ بھی ملا، پہلے خط کو منسوخ کرنا پڑا، اس خبر سے گونہ اطمینان ہوا کہ بالفعل کوئی ظاہری تکلیف باقی نہیں رہی ہے، لیکن (۴۸) گھنٹے کھڑے کھڑے گذار دینا، میرے لیے تو اسکا تخیل بھی تکلیف کی شکل اختیار کیے ہوئے ہے، جس کسی نے سنا اسے قدرۃً تکلیف پہنچی، کیا عرض کروں، ہم جیسے گنہ گاروں اور سیاہ کاروں کے لیے تو یہ امراض ومصائب سب کفارے کی حیثیت رکھتے ہیں، سمجھتا ہوں کہ جن سزاؤں کو جہنم میں بھگتنے والا تھا، شاید الرحم الراحمین کی رحمت شاملہ نے ان ہی کو دنیاوی مصائب وآلام کی شکل میں بدل دیا ہے، لیکن آپ جیسے حضرات کے متعلق کیا سوچوں، بجز اس کے کمال وفاداری کے اظہار کی شکل یہی ہو سکتی تھی، الحمدللہ کہ قلب جب اسی مقام پر ہے جہاں ہوا اسے رہنا چاہیے تو ڈاکٹروں کے اس کہنے سے کیا ہوتا ہے کہ وہ گھٹ گیا ہے یا بڑھ گیا، حضرت سلطان جی نے ایک لطیفہ نقل کیا ہے کہ کسی برہمن پر راجہ یا بادشاہ کا عتاب ہوا، سب کچھ ضبط کر لیا گیا، جو اس کے پاس تھا، کسی نے پوچھا کہ کیسی گذر رہی ہے،

بولا خوب ہی گذر رہی، پوچھنے والے نے کہا کہ سب کچھ تو ضبط ہو گیا، خوب کیسے گذرتی ہوگی، بولا "زنار من باسمن است" بس ایمان ساتھ رہ جائے اور انشاء اللہ وہ اپنی جگہ قائم ہے، الحمدللہ کہ اہل ایمان نے آپ کے ایمان کی توثیق کی ہے، اس سے زیادہ اب اور کیا چاہیے، ایک لطیفہ مجھے اپنا بھی یاد آیا، زخموں سے چور پہلی دفعہ جب پٹنہ ہسپتال میں داخل ہوا تھا، اس وقت آپ نے نہیں دیکھا تھا، دوسرے حملہ میں آپ سے پٹنہ میں ملاقات ہوئی تھی، اس دفعہ جسم کے ہر حصے اور ہر عضو میں اندرونی زخم پیدا ہو گئے تھے، انکی ٹیک اور کرب وبے چینی جو ہوئی تھی کیا عرض کروں، بلامبالغہ عرض کر رہا ہوں کہ تقریباً دو ماہ میرے اس ہسپتال میں جو گذرے، تمام آرزوئیں دل سے نکل گئی تھیں، اور باقی کوئی آرزو اگر اس دنیا کے متعلق رہ گئی تھی تو صرف یہ کہ دو ہی سکنڈ کے لیے سہی لیکن مجھے کوئی بٹھا دیتا، پیٹھ کے بل جو سوتا تھا تو دو زخموں پر سوتا تھا، دونوں شق میں ایک ایک زخم تھا اندرونی، کئی کئی دن کے بعد آپریشن کر کے ان کا مواد خارج کیا جاتا تھا، خیر، قصہ یہ ہے کہ ایک صاحب اسی وارڈ میں جس میں میں تھا، مریض بن کر آئے، غالباً انکو سل یادق کی بیماری تھی، مجھ نیم مردہ کے پلنگ کے پاس کبھی کبھی آکر بیٹھ جاتے لیکن ہمیشہ مغموم اور متفکر سر جھکائے رہتے، میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ مولانا! آپ کی بیماری تو ایسی ہے، جس سے انشاء اللہ شفا کی توقع بھی ہے، اور مجھے تو ایسی بیماری نے پکڑا ہے کہ جان ہی لے کے ٹلے گی، اس پر فقیر نے ان سے ایک بات کہی تھی، میں نے عرض کیا کہ بھائی! یہ تو صحیح ہے کہ مرنے کا خطرہ آپ کے سامنے ہے، لیکن یہ خطرہ کب پیش آئے گا، اسکی مدت تو مقرر نہیں ہے، اور اگر اسی کو آپ خطرہ قرار دیے ہوئے ہیں تو میرے نزدیک ہر وہ شخص جس میں زندگی اور حیات کی بیماری پیدا ہو گئی ہے اسکو مرنا پڑیگا، اس میں آپ کی کیا خصوصیت ہے، اس مرض میں تو ہر وہ شخص مبتلا ہے جسے لوگ حی اور زندہ کہتے ہیں۔ کہی تو میں نے شاعری، لیکن اس مریض کو دیکھا کہ اچانک اس کا چہرہ بشاش ہو گیا، اور کہنے لگا، یہ تو آپ نے ایسی بات کہی کہ اب انشاء اللہ مجھے یہ فکر تو کبھی ستا نہیں سکتی، بعد کو جب ملنے آتے تو یہی کہتے کہ زندگی خود ایک بیماری ہے جسے لگ گئی، اسے مرنا ہی پڑے گا، "واہ مولوی صاحب آپ نے خوب بات

فرمائی، واقعہ یہ ہے کہ اب جب میں سوچتا ہوں تو بات اتنی غلط میں نے نہیں کہی تھی،

آپ کے دوسرے والا نامہ میں یاس کے آثار بہت محسوس ہوئے، لیکن اسی کے ساتھ یہ عجیب بات آپ نے ارقام فرمائی کہ اب تم لوگ اسے سنبھالو، گویا جن لوگوں سے آپ کا خطاب ہے، کچھ زیادہ وقفہ انکی روانگی میں ہے، پچاس سے متجاوز ہو جانے کے بعد زندگی کا انسانی استحقاق میرے نزدیک ختم ہو جاتا ہے، انسانیت کے کامل ترین نمونے نے یہی نمونہ ہمارے لیے چھوڑا ہے، باقی اس کے بعد کیا ہوگا جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی دنیا چلتی ہی رہی، اور دنیا کیا دین کا کام بھی چلتا ہی رہا، تو اب اس کے بعد کوئی ہو، ہم ہوں یا آپ، کسی پر بھی ظاہر ہے کہ دین و دنیا کا کوئی کام موقوف نہیں رہ سکتا، خداوند تعالی کا ہزار ہزار شکر ہے کہ ایک بڑے مومن کا دامن آپ کو آخر وقت میں مل گیا، اور مجھے تو سب سے زیادہ مسرت اس کی ہے کہ آپ کا رابطہ با لشیخ بحمد للہ غیر معمولی طور پر محکم و استوار ہے، حق تعالی کے آپ محبوب ہیں، آپ ان لوگوں میں ہیں جن کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ یحبھم و یحبونہ، اللہ میاں ہی نے آپ کو پہلے چاہا ہے، اسی لیے تو زندگی کے ہر ہر قدم پر آپکے سامنے آپ کے چاہنے والے اسی چیز کو پیش کیا جسے زندگی کے اس مرحلہ پر پیش ہونا چاہیے تھا،

معاف فرمایئے گا، خدا جانے کیا کیا لکھ گیا، آپ کے آخری خط کے پڑھنے سے دل بہت متاثر ہوا، اسی تاثر نے بے ساختہ قلم کو رواں کر دیا، اور کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں ہے، مولوی شبیر احمد صاحب بھی بیمار ہیں، مجھے تو توقع نہیں کہ دکن آسکیں گے، کاش! نہ آئیں، تو ان کے لیے اچھا ہے، زندگی کے آخری دنوں میں عزت و آبرو کے ساتھ چلا جانا ہی زیادہ مناسب ہے، فقط

مناظر احسن گیلانی

ہاں! ایک چیز جسے لکھنے والا تھا، وہی بھول گیا، گیلانی کا ایک ہم سرحد گاؤں اسلامی برگانواں ہے، شیوخ کی بستی ہے، اسی بستی کے ایک ممتاز کھاتے پیتے خاندان کے ایک نوجوان مولوی عبدالحنان ایم اے جو آج کل کھڑگ پور میں ہیڈ ماسٹر ہیں، انھوں نے لکھا ہے کہ شبلی کالج اعظم گڈھ میں تاریخ کے استاد کی ضرورت ظاہر کی گئی ہے، درخواست انھوں نے بھی دی ہے، آدمی محنتی اور جفاکش اور زیادہ ٹیپ ٹاپ کے نہیں ہیں، اگر آپ کی رائے کو بھی تقرر میں کچھ دخل ہو تو دوسرے امیدواروں کے ساتھ ان کا بھی خیال رکھیے گا، مولانا مسعود علی صاحب کو دل لکھنے پر آمادہ نہ ہوا۔

۲۴ر اپریل ۱۹۴۵ء

گیلانی (بہار) ڈاک خانہ برگھا

سیدی دمتم بالہناء والعافیہ	السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

یہ عریضہ گیلانی سے لکھ رہا ہوں، اعظم گڈھ کے متعلق تو قطعی طور پر نہیں کہہ سکتا، لیکن لکھنؤ ہوتے ہوئے بہار آنے کا ارادہ جزماً طے شدہ تھا، ٹکٹ بھی مولانا عبدالباری کے ساتھ لکھنؤ کا پندرہ دن پہلے لے چکا تھا، برتھ بھی ریزرو کرا چکا تھا، خیال اس کا ضرور تھا کہ اگر لکھنؤ میں آپ حضرات سے نیاز حاصل ہونے کا موقعہ مل گیا تب تو خیر، ورنہ ہلکا سا ارادہ یہ بھی تھا کہ اگر گاڑی میں زیادہ زحمت نہ پیش آئی تو ایک دن دار المصنفین کا بھی حاصل کر لوں، لیکن اعظم گڈھ تو اعظم گڈھ، لکھنؤ جانا بھی میسر نہ ہوا، ٹکٹ بدلوانا پڑا، اور مولوی عبدالباری صاحب کے چند دن بعد حیدر آباد سے روانہ ہوا، ایک ہفتہ کے قریب پٹنے میں قیام رہا، اور آج کسی نہ کسی طرح ہانپتے کانپتے گیلانی پہنچ گیا ہوں، مستزاد ہو کر دکن کی جو ڈاک گیلانی پہنچی ہے، اسی میں دار المصنفین کا بجٹ بھی تھا، دستخط کر کے اسے واپس کر رہا ہوں،

ادھر حیدر آباد میں مختلف ذرائع سے معلوم ہوتا رہا ہے کہ نواب بھوپال آپ کو اپنے محروسہ کا قاضی القضاۃ اور کسی نئی قائم ہونے والی جامعہ کا امیر بنا کر وہیں قیام کرنے پر مصر ہیں، خیال تھا کہ اس مسئلہ پر بھی لکھنؤ ہی میں شفاہاً گفتگو کا موقعہ ملے گا، میرے نزدیک تو اس میں بظاہر کسی قسم کا حرج نہیں معلوم ہوتا، بھوپال میں رہ کر بھی جہاں تک میں خیال کرتا ہوں، آپ ان خدمات کو انجام دے سکتے ہیں، جنھیں اس وقت اعظم گڈھ

میں انجام دے رہے ہیں، اور دار العلوم ندوۃ العلماء کی جتنی نگرانی اعظم گڈھ سے اس وقت تک کر رہے ہیں بھوپال سے بھی کر سکتے ہیں، بلکہ اسی کے ساتھ اپنے خاص مقاصد و اغراض کے مطابق آپ تعلیمی مہمات کے حل پر بھی ایک حد تک قادر ہو سکتے ہیں، حیدر آباد میں تو دھوکہ دیا گیا، دار العلوم کو توڑ کر جامعہ بنانے کا خیال مولانا حمید الدینؒ نے جن عزائم کو پیش نظر رکھ کر فرمایا تھا، وہ پورے نہ ہوئے، افسوس کہ دار العلوم تو ٹوٹ گیا، لیکن اسی کے ساتھ مولانا کے عزائم کو بھی بری طرح کی شکست نصیب ہوئی، شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ کے سینے کا بوجھ بنا ہوا ہے، خدا کرے بھوپال میں آپ کو موقعہ اس شکست کی تلافی کا مل جائے، مجھے اس کا افسوس ہے کہ طول کلامی کی وجہ سے میرا مقصد لوگوں پر ظاہر نہ ہو سکا، حالانکہ اس کے سوا اور میں کیا چاہتا ہوں کہ اسلام کے اساسی علوم (قرآن وحدیث وفقہ) کی تعلیم کو لازم قرار دے کر قدیم علوم کی جگہ جدید علوم و فنون کو قبول کر لیا جائے، اور اسلامی علوم کے کسی خاص فن میں کمال پیدا کرنے کے لیے تخصیصی درجے قائم کر دیے جائیں، میرا خیال ہے کہ اس طریقہ سے نصاب کی دوئی کو ختم کر کے مسلمانوں کے لیے ایک ہی تعلیمی نصاب کے قائم کرنے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے، میری یہ بدقسمتی ہے کہ آپ جیسے بزرگوں نے بھی میرے منشا کے سمجھنے یا کم از کم سمجھانے میں تغافل سے کام لیا،

بہر حال بھوپال میں اگر کوئی میدان عمل کا مل سکتا ہے تو اس کو چھوڑنا ممکن ہے کہ مسئولیت کی وجہ بن جائے، حیدر آباد کی سرزمین اس قسم کے اصلاحی کاروبار کے لیے کم از کم جہاں تک میرا تجربہ ہے شور ہے، لیکن علی یاور جنگ اگر آپ کے مشوروں سے مستفید ہونا چاہیں، تو اس سے بھی گریز مناسب نہ ہوگا، ہو سکتا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے ساتھ ساتھ کسی جامعہ عربیہ کے قیام کا امکان پیدا ہو جائے،

پٹنے میں ایک ہفتہ کا قیام صرف سوز اور اندرونی خلش میں گذرا، عجب بے حسی اور مردنی وہاں کی اسلامی آبادی پر چھائی ہوئی ہے، آپ کی تجویز "جامع عظیم آباد" کا خیال مسلسل دماغ پر

مسلط رہا، کاش! کسی مسجد جامع کے قائم کرنے میں وہاں کامیابی ہو جائے، آپ اگر ہمت سے کام لیں تو بات زیادہ دشوار نہیں ہے، لان کے پاس جو ایک چھوٹی سی مسجد مسلمانوں کی ہے، مغرب کی نماز کئی دفعہ اسی مسجد میں پڑھنے کا موقعہ ملا، اسی کے سامنے عیسائیوں کا ایک کلیسا بھی سڑک کے دوسری جانب قائم ہے، اس کی بلندی، اس کی صفائی، اس کا شاداب و سرسبز باغ اور زمین کی وسعت اور اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کا یہ جھونپڑا، دیر تک باعث تحسر بنا رہا، خیال آتا تھا کتنے دن کی بات ہے اسی سرزمین کے ہم بادشاہ تھے، "يَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ" کا مقام اس علاقہ میں حاصل تھا، اور آج جنھوں نے زمین کے ایک بڑے قطعہ پر قبضہ کر کے "صلیب خانہ" بنایا ہے، ان کی حیثیت وہی تھی جو آج ہماری یہاں ہے، خالق کے پوجنے والوں کی خالق کی زمین پر یہ بے بسی، اور مخلوق پرستوں کا یہ زور، بظاہر ایک غیر منطقی سی بات نظر آتی تھی، لیکن دل نے کہا کہ خالق پرستی کے مدعی کاش خالق پرست ہوتے تو یہ صورت ہی کیوں پیش آتی،

آپ کیا اب کی گرمیوں میں دسنہ تشریف لائیں گے، آم کی فصل گیلانی میں تو اچھی ہے، میرے باغ میں دسہری کے ایک دو سالہ درخت تھے، پھلوں سے اس کو لدا ہوا پایا، اسی پر قیاس کر کے کہتا ہوں کہ آپ کا باغ جو زیادہ تر دسہری کے درختوں سے عبارت ہے وہ تو "قُطُوفُهَا دَانِيَةٌ" کا سماں پیش کر رہا ہوگا، اور کیا عرض کروں، بظاہر بدامنی میں کچھ خفت نظر آتی ہے، اگرچہ حال میں بھی ڈکیتی کا ایک واقعہ موضع دیو کلی کے ایک گچھے میں پیش آیا ہے، ایک کوئری کسان کے مکان پر ڈاکوؤں نے حملہ کیا اور نقد و زیور لوٹ کر لے گئے، بعض لوگ زخمی بھی ہوئے، فقط

نیاز مند

مناظر احسن گیلانی

باب التقریظ والانتقاد

جہاد اعظم کی تیاری

از جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب

مصنفہ حضرت صوفی نذیر احمد صاحب کاشمیری صفحات ۱ + ۹۵ = ۹۶، ناشرین: نذیر احمد، اسلامی کتاب گھر، اردو بازار، دہلی ۶ ۔ (۲) منیجر مکتبہ مسلم، انسمہ بازار، گاؤکدل، سری نگر، کشمیر۔ قیمت ۱۲/

یہ عجالۂ نافعہ ملک کے مشہور صوفی مفکر، مصلح حضرت نذیر احمد صاحب کاشمیری مدظلہ العالی کے افکار عالیہ کا خلاصہ ہے، جو چار عنوانات کے تحت اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے: (۱) تقویۃ الایمان (۲) تعلیم الاسلام (۳) تذکیر الاحسان (۴) تبیان العمران، رسالہ کے موضوع کو ٹائٹل پیج ہی پر مصنف علام نے ان الفاظ میں واضح کیا ہے:۔

"موجودہ دور نے دو کھلے کھلے امکان نوع انسانی کے لیے پیدا کر دیے ہیں: (۱) پوری نوع انسانی اپنی ساری نوعی خصوصیات اور امتیازات کو کھوئی ہوئی اور دین بہائم اور دین نباتات کا مظاہرہ کرتی ہوئی دنیا سے ناپید ہو جائے، یا (۲) ساری بے دینیوں سے تائب ہوتی ہوئی انسانی دین واحد کی صراط مستقیم پر آجائے، میری کوشش پورے شعور و قوت اور پورے احساس ذمہ داری سے دوسرے امکان کو عملی حقیقت میں بدلنے کے سلسلے میں رہی ہے اور موجودہ رسالہ بھی اسی کی ایک کڑی ہے، امت مسلمہ اس جہاد اعظم

کے لیے کیونکر تیار ہو، اس رسالہ کا یہی موضوع ہے۔" اس جہاد اعظم کے لیے مسلمانوں کو تیار کرنے کے لیے حضرت مصنف اپنی زندگی کے ۲۹ سال نذر کر چکے ہیں اور یہی داعیہ مسلمانوں کے قلوب میں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

زیست ہے امتحاں ترا تو ہے امین زندگی
ساری متاع جسم و جاں کو ہدیۂ نیاز کر (مصنف)

رسالہ کا لفظ لفظ اخلاص میں ڈوبا ہوا ہے، اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ کا محرک شروع سطر سے آخر تک کارفرما نظر آتا ہے، حق تعالیٰ مصنف کو اس کا اجر غیر ممنون عطا فرمائے۔

پہلے عنوان "تقویۃ الایمان" میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ اسلام کا تعلق ظاہری اعضا کے اعمال سے ہے، اور ایمان کا تعلق قلب سے، اگر قلب ظاہری اعمال سے ہم آہنگ نہیں تو یہ ظاہری اعمال محض ظاہرداری اور معاشرے کی ہمنوائی کے سوا کچھ اور نہیں قرار دیے جا سکتے، اس سے اصلاح قلب کی دینی اہمیت کا خود اندازہ ہو سکتا ہے، اور خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "جسم انسانی میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، اگر اس کی اصلاح ہو جائے تو سارے جسم کی اصلاح ہو جاتی ہے، اور اگر وہ فاسد ہو جائے تو سارا بدن فاسد ہو جاتا ہے، اور وہ گوشت کا ٹکڑا قلب ہے، "الا وھی القلب" گویا دینی اصلاح و فساد کا سارا انحصار قلب کی اصلاح و فساد پر ہے۔

ظاہر ہے کہ مصلح بننے سے پہلے آدمی کو صالح ہونا ضروری ہے، اور صالح ہونا قلب کی اصلاح پر منحصر ہے، مصنف نے اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ قلب کی بڑی بڑی بیماریوں کا ذکر کیا ہے، جو غفلت زیغ اور رین ہیں، اور ان کے دفع کرنے کے مسلم طریقے پیش کیے ہیں، جو نہایت مفید ہیں، مسلمانوں کو ان پر عمل کی توفیق رفیق حق تعالیٰ عطا فرمائے۔ اس کے بعد نفس کا تزکیہ ضروری ہے، نفس امارہ بالسوء ہے اور اسی کے تزکیہ پر قرآن حکیم کی رو سے "فلاح" کا دار و مدار ہے: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا۔

"نفس عام حیوانات کی طرح بطن و فرج کے تقاضوں کو بلا روک ٹوک پورا کرنے پر آمادہ رہتا ہے، لیکن قلب اس پر حلال و حرام کی پابندیاں عائد کرتا رہتا ہے، لہذا نفس کے حیوانی رجحانات اور قلب کی اخلاقی پابندیوں میں یکرنگی و یکسانی پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ایک طرف ہم قلب کو ذکر و دعا سے قوی کرتے ہیں اور دوسری طرف نفس پر جواز و عدم جواز کی پابندی اور مجاہدات کی قید عائد کرتے جائیں، اور اس کو کمزور کرتے جائیں، تاکہ وہ رضائے الٰہی کا پابند ہو جائے اور ہم صبح و شام کی اندرونی کشمکش سے نجات پاکر سکون و طمانیت کی زندگی بسر کر سکیں، یہی ہے "قد افلح من زکٰھا" کی حقیقت۔" (ص ۹۰)

تزکیۂ نفس کی اہمیت کے بتلانے کے بعد "نفس کی مرکزی بیماریوں" کی نشاندہی کی گئی ہے، جو (۱) اتباع ہویٰ و (۲) اتباع تمنا ہیں، اس سلسلہ میں صوفیائے کرام نے جس تفصیل سے کام لیا ہے اور نفس کی ایک ایک خامی کی نشاندہی کی ہے، اور اس کا علاج تجویز فرمایا ہے، ہمارے مصنف علام نے اس کا اعادہ ضروری نہیں تصور فرمایا اور صرف مرکزی امراض کی وضاحت پر اکتفا فرمایا، زیادہ تفصیل و تحقیق کے لیے امام غزالی کی کیمیائے سعادت یا احیاء العلوم کا مطالعہ ضروری ہے، بلکہ ناگزیر ہے، اس فن کے امام تو غزالی ہی ہیں!

اس عنوان کے اختتام پر حضرت مصنف نے فرمایا ہے اور بجا فرمایا ہے: "آج انسانی ماحول میں جو ایمان سوز بے چینی عالمگیر انداز اختیار کرتی جا رہی ہے اس کا علاج نہ علم الکلام ہے، نہ منطق نہ آبیاری یقین کی بجائے جدلیت سے ممکن ہے، بلکہ اس کا واحد علاج اس سارے سلسلہ کے امکانات کو بند کرتے ہوئے یقین کی ساری بند سوتیں کھول دینی ہیں اور بس۔ یقین انسانی کی یہ سوتیں صرف قلب صالح مطمئن و قوی ہے اور دوسرے درجہ پر نفس مزکی آتا ہے، پہلے سے اعتصام باللہ پیدا ہوگا اور دوسرے سے اعتصام بحبل اللہ اور استقامت علی الدین پیدا ہوں گے، اور صرف ان ہی سے موجودہ دور کے الحاد کا مقابلہ ممکن ہے۔" (ص ۱۴۰)

بات بڑی سچی ہے لیکن حضرت مصنف علام کی توجہ صحبت اور دعائیں غایت کے حصول کے لیے بڑی ضروری نظر آتی ہیں، ورنہ محض جان لینے اور مان لینے سے نہ قلب ہی کا تصفیہ آسان ہے اور نہ نفس کا تزکیہ! ہاں حق تعالیٰ اگر کسی بندہ کے حال پر خود توجہ فرمائیں تو سب کچھ اس کے لیے آسان ہے، "ثم تاب اللہ علیہم لیتوبوا" کی رو سے تو حق تعالیٰ ہی کا متوجہ ہونا انسان کے متوجہ ہونے سے پہلے ضروری نظر آتا ہے، لیکن کوشش و کاوش بھی کشش الٰہی کے لیے ضروری ہے، اس سے غفلت نہیں جائز رکھی جا سکتی، اور اس کے لیے مصنف علام کے بتائے ہوئے طریقے چراغ راہ بن سکتے ہیں،

کتاب کا دوسرا حصہ "تعلیم الاسلام" یعنی تجدید دین و ملت ہے، اور نہایت اہم ہے۔ اس میں موجودہ لادینیت کی فضا کے اسباب و علل کی تحلیل کی گئی ہے، ہمارے اصلی کا روگ تو یہ بتلایا گیا ہے کہ خاص دین ز الفعل و واجبات دینی کی جگہ رسوم شرکیہ و بدعات سیئہ نے لے رکھی ہیں، جن کا دین و مذہب سے دور کا بھی تعلق نہیں، بلکہ تصور دین ان سے منہدم ہوتا ہے، ان کا ترک کرنا نہایت ضروری ہے۔ رہی جدید بیماریاں تو وہ انکار خدا سے شروع ہو کر تمام انسانی تعلیم و تربیت کو کھلے فحشاء و منکر پر تعمیر کرنے کی حد تک پھیل گئی ہیں اور پھیلائی جا رہی ہیں، ہر دینی ادارہ (مسجد ہو یا خانقاہ) کے مقابل کلچر یا ثقافت کے نام سے ایسے ادارے قائم کیے جا رہے ہیں جو سارا بچا کھچا وقت لے لیتے ہیں، اور انسان کے لیے اپنی اخلاقی و روحانی زندگی کے سدھار کے واسطے ایک منٹ بھی باقی نہیں چھوڑتے، اس ہمہ گیر لادینیت کی ترویج میں حکومت کو بڑا دخل ہے، قلب کی موت کا یہ سامان خود حکومت فراہم کر رہی ہے اور انسان محض جسم اور اس کی آسائشوں کا نام رہ گیا ہے، "لذتیت" ہی اخلاقی نظام رہ گیا ہے، ابیکیورس اور ارسطیوس کے فلسفہ کا از سر نو جدید میں شدت سے احیاء ہوا ہے، معیار حق و باطل صرف یہ رہ گیا ہے کہ جو چیز لذت بخش ہو وہ خیر ہے اور جو الم پیدا کرتی ہے وہ شر ہے، تمام اخلاقی و روحانی اقدار بے معنی ہیں اور دور جہالت کی یادگار،

مصنف علام کے خیال میں اس عالمگیر طوفان لادینیت کا علاج صرف یہ ہے کہ ملت کے سارے افراد

کی بصیرت ایک معین لائحہ عمل اختیار کرکے اس طوفان کا مقابلہ کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام کسی ایک فرد
کی قوت سے باہر ہے، تاہم وہ دینی اصلاح اور جمہور ملت کی بیداری کے لیے چند ایسے نکات پیش
فرماتے ہیں جو صحیح سمت کی طرف رہنمائی کے لیے قدم اول کا کام دے سکیں، ان کی رائے میں اصلاح
کا اصل نسخہ یہ ہے کہ ہر گھر، محلے اور گاؤں یا قصبہ یا شہر میں دینی احساس رکھنے والا شخص قرآن مجید کا
ایک جچا تلا ترجمہ اپنے سامنے رکھ لے اور اپنے وقت کے چوبیس (۲۴) گھنٹوں میں سے کم از کم آدھ گھنٹہ ایسا
نکال لے جس میں وہ اپنے دائرۂ اثر میں یہ ترجمہ بلا کم و کاست سنا دیا کرے، خطابت، بلاغت اور
فصاحت سے کام نہ رکھے، بلکہ صاف و واضح طور پر قرآن کا پیام پہنچا دے اور یہ سمجھا دے کہ اس
کتاب مبین میں ہمارے لیے کیا کیا ہدایات ہیں، زندگی بسر کرنے کے کیا طور طریقے بتلائے گئے ہیں، سننے والے جان لیں کہ

(۱) ہمیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔

(۲) مومن میں کن اخلاق کا ہونا ضروری ہے، اور کن اخلاق یا صفات کا نہ ہونا ضروری ہے۔

اتنا کام اگر ہو جائے تو انشاء اللہ پوری ملت کے لیے بہت جلد سعادت کی راہیں کھلنی شروع ہو جائیں گی،
اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی مبلغانہ انداز سے لکھی ہوئی
سیرت مثلاً رحمۃ للعالمین مولفہ قاضی محمد سلیمان صاحب اور اس کے ساتھ ہی اخلاق نبوی پر پوری
روشنی ڈالنے والی کوئی کتاب مثلاً امام بخاریؒ کی ادب المفرد (اردو ترجمہ "کتاب زندگی") کو بھی
اسی تربیتی کورس میں شامل کر لیا جائے، ہفتہ بھر میں پانچ دن تو قرآن مجید کا ترجمہ ہو اور دو دن
سیرت و اخلاق نبوی کا درس ہو، یہ بہت ضروری ہے کہ اس سلسلہ کا آغاز اور خاتمہ دعا و الحاح کے
ساتھ ہو۔ اصلاح، دل سوزی اور خیر اندیشی اس ساری سعی کی روح ہو، ایمان باللہ، اخلاق صالحہ
اور مسلمہ فرائض و واجبات پر تاکید و اصرار ہو، فقہی نوعیت کے مسائل پر بحثیں کم سے کم ہوں، فقہی
مسائل کی تحقیق علماء سے کی جا سکتی ہے، اگر ہم مسلمہ فرائض و واجبات اور صدق دل کے مسلمہ اخلاق و

ایمان تک خود کو محدود کر لیں تو سارے اختلافات ختم ہو سکتے ہیں، اور انھیں ختم ہونا ہی چاہیئے،
یہ اصلاحی پروگرام پیش کرتے ہوئے ہر قدم پر اول اپنے نفس کا محاسبہ ضروری ہے، دوسرے درجہ پر
اپنے مخاطبین کا محاسبہ اور تیسرے درجہ پر سارے ماحول کا اندازہ اور جائزہ لیتے رہنا کہ ان تینوں مواقع
پر کس درجہ اصلاح ہوئی ہے، اس چیز کو ایک مرکزی اصول کی حیثیت سے سامنے رکھا جائے،
صوفی صاحب کا یہ پروگرام ہر ہوشمند، دردمند، صاحب فکر کے لیے قابل عمل ہے، اور اس پر عمل
کیا جانا ضروری ہے، یہ عوام کی اصلاح کا نہایت مفید و کارگر نسخہ ہے، اس کی افادیت کا اندازہ
چند روز اس پر عمل کرنے سے خود محسوس ہونے لگے گا حق تعالیٰ مقلب القلوب ہیں، دعا ہے کہ
مسلمانوں کے قلوب کو دین کی طرف پھیر دیں، وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

پیش نظر کتاب کے آخری حصہ میں مصنف علام نے اسلام کے عمرانی نظام کا ذکر فرمایا ہے،
اور "تبیان العمران" اس کا عنوان مقرر کیا ہے، اس میں خدا، رسول اور امت اسلامیہ کا تعارف
کرایا گیا ہے، یہ حصہ بھی نہایت مفید ہے اور بیش بہا معلومات کا خزانہ ہے، اگرچہ حق تعالیٰ کی بہت سی
صفات ہیں، اور ہر صفت میں ان کو واحد و لاشریک ماننا نہایت ضروری ہے لیکن جس صفت کو ہر قرآنی سورت
میں اور ہر عمل صالح کی تمہید کی حیثیت سے صبح سے لیکر شام تک ہمیں بار بار دہرانا پڑتا ہے، وہ حق تعالیٰ کی رحمت ہے،
رحمتی وسعت کل شیٔ، ربنا وسعت کل شیٔ رحمۃ و علما۔ جب اس صفت کا ہمارے قلب
و نفس پر احاطہ ہو جاتا ہے تو پھر نفرت و حقارت و انتقام جیسے سارے حیوانی جذبات صرف خیر اندیشی
محض دل سوزی و ہمدردی میں مبدل ہو جاتے ہیں، معاشرۂ انسانی کے تعاون و یگانگت کی بنیاد اگر خیر اندیشی
و دل سوزی نہیں تو وہ ہرگز پائیدار نہیں ہوتی،

رسول کے تعارف کے لیے "وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین" اور "فبما رحمۃ من اللہ
لنت لھم ولو کنت فظا غلیظ القلب لانفضوا من حولک" کی دو آیتیں پیش کی گئی ہیں، نیز

بالمومنین رؤف رحیم سے بھی استدلال کیا گیا اور بتلایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت سارے عالم کے لیے صرف رحمۃ للعالمین ہے، دوسری اور تیسری آیتوں میں مومنین کے ساتھ آپ کے تعلق رحمۃ ہی کا ظاہر کیا گیا ہے، طائف کے سفر میں جو اذیتیں رسول عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچائی گئیں ان کے بعد بھی آپ نے اپنی قوم پر لعنت نہیں کی بلکہ فرمایا کہ مجھے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا گیا ہے، اور اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون ہی کی دعا زبان مبارک پر جاری ہوئی،

امت اسلامیہ کا تعارف "اشداء علی الکفار رحماء بینھم"، انما المومنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم واتقوا اللہ لعلکم ترحمون سے کیا گیا ہے، مومن کو مومن سے وابستہ کرنے اور ان کو آپس میں بھائی بھائی بنانے والا رشتہ رحمت خاصۂ حق ہے،

مختصر یہ کہ حق تعالیٰ کا بنیادی تعارف رحمٰن، رحیم، ارحم الراحمین اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تعارف رحمۃ للعالمین ہے، اور امت مسلمہ کے تمام تعلقات باہمی کے مربوط کرنے کے لیے جس تعارف کو پیش نظر رکھنا ہے وہ کامل ترین رحمت سے قوام پانے والا جذبہ رحمت ہے جس کو اخوت مومنانہ کہا جاتا ہے

اس علم و یقین کے بعد مسلمانوں کا فرض ہے کہ مذکورہ صدر چوکھٹے میں اپنی تمام انفرادی و اجتماعی زندگی کو اس طرح سمیٹ لیں کہ ان کی زندگی کا کوئی حصہ اس چوکھٹے سے باہر نہ رہ جائے، اور اگر اس جذبۂ رحمت سے "ذات البین" کا کوئی سوال طے نہ ہو تو اس کو خدا کے سپرد کرتے ہوئے جھگڑے فساد سے کنارہ کشی اختیار کر لی جائے، جامع و نافع دینی امارت کی عدم موجودگی میں ہمارا طریق اصلاح صرف رحماء بینھم ہی تک محدود ہے، تعزیرات کا اجرا صرف امارت کا وظیفہ ہے"

"رحمت خداوندی و عدل خداوندی" "دعوت الی اللہ اور امر بالمعروف" وغیرہ عنوانات کے تحت نہایت مفید اور کارآمد مواد پیش کیا گیا ہے، جو ہر تعلیم یافتہ فرد کے غور و فکر کا محتاج ہے،

صوفی صاحب نے امت کی اصلاح کا جو پروگرام پیش کیا ہے اس سے کسی ذی عقل کو انکار کی

مجال نہیں مگر اتنا کہنے کی جرأت کی جا سکتی ہے کہ صوفی صاحب اب کسی مقام پر اطمینان کا قیام فرمائیں اور اس کام کا آغاز اپنی رہبری و رہنمائی میں شروع فرما دیں، اپنی صحبت و توجہ سے چند افراد کو اس کام کے بنانے اور آگے بڑھانے کے قابل بنا دیں تاکہ اس ملت خفتہ کی ساری صلاحیتیں بالقوہ سے بالفعل ہو جائیں اور خارج میں بھی انقلاب پیدا ہو جائے، ایک عرصہ سے صوفی صاحب کے بعض دردمند و ہوشمند احباب انکی خدمت میں یہ مشورہ پیش کرتے رہے ہیں، ہمیں امید ہے کہ اب وہ اس کام کی طرف متوجہ ہوں گے۔ ع

ہر کہ یکجا ہمہ جا و ہر کہ ہمہ جا ہیچ جا!

پیش نظر مجالہ نافعہ کا تیسرا حصہ "تذکیر الاحسان یعنی تحسین اعمال و تطہیر محرکات" کے عنوان سے ۲۴ صفحات پر مشتمل ہے، جو قیمتی مواد اس حصہ میں پیش کیا گیا ہے اس کا تعلق "تصوف" سے ہے اور اس پر مصنف علام نے اپنی دوسری تحریروں میں بھی اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے، انھوں نے شروع ہی سے یہ سعی فرمائی ہے کہ دین کو ایک طرف باطل "باطنیت" اور دوسری طرف باطل "ظاہریت" سے صاف کیا جائے، "محبت" کی ماہیت اور اس سے افراط و تفریط کو چھانٹ کر ایک طرف کر دینا، اسی طرح حقیقت خشیت اور رضا کا حکیمانہ تجزیہ کرنا اور معاشرہ کو ان کی جانب متوجہ کرنا ہمیشہ سے ان کے پیش نظر رہا ہے، ان ہی اہم نکات کو نہایت عمدگی اور وضاحت سے اس حصہ میں پیش کیا گیا ہے، جزاہ اللہ خیر الجزاء۔

محبت کے سلسلہ میں صوفی صاحب تحریر فرماتے ہیں، "چونکہ صوفیہ نے زیادہ تر محبت ہی کو تمام اعمال کا محرک مانا ہے لہٰذا اس کے باعث کتاب دین کے سارے ابواب اپنی قدرتی ترتیب سے محروم معلوم ہونے لگتے ہیں جس کے باعث باطن دین کی تکمیل کا نصب العین ہی سرے سے مستور ہو کر محض باطنیت بنایا جاتا ہے، یا صرف باطنیت رہ جاتا ہے، جہاں محب و محبوب کی ثنویت کو ختم کرتے ہوئے دونوں کا ایک ہونا یا ایک کرنا ہی کمال سمجھا جاتا ہے اور اس طرح دین و آئین

کی ساری حدود کو جلا کر خاکستر کرتے ہوئے "من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی" کا معاملہ کر دیا جاتا ہے،...... اور محبت کی اس امتیاز سوز ڈگری یا درجہ کا نام "عشق" رکھا گیا ہے، اور اس حضرت عشق کی خاصیت "ہر چہ جز معشوق باشد جملہ سوخت" ہے، اس کا کام محب و محبوب کی ثنویت کو ختم کرتے ہوئے دونوں کی اتحادِ ذاتی کا فتویٰ دینا ہے۔" (ص ۳۵)

صوفی صاحب کو اس امر سے اختلاف کی گنجایش نہیں کہ بقول حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی: "اتفاقِ اصحاب طریقت و ارباب حقیقت است کہ اہم مطلوب و اعظم مقصود از خلقت بشر محبت رب العالمین است۔" (سیر الاولیاء ص ۴۵۵) چنانچہ حضرت محبوب الٰہیؒ اپنے مریدوں کو تلقین فرمایا کرتے تھے کہ "ہمہ وقت از خدائے عزوجل محبت حضرت حق می باید خواست و ایں دعا بسیار باید خواند: اللهم انى اسئلك حبك وحب من يحبك والعمل الذى يؤدى الى حبك ـ اللهم اجعل حبك احب الى من نفسى واهلى ومالى وماء البارد الى العطشان۔" (ص ۴۹۵)

حجۃ الاسلام امام غزالیؒ کی تحقیق میں مقامات سلوک میں بلند ترین مقام محبت ہی کا مقام ہے، اس کے سوا جو مقامات ہیں وہ یا تو مقام محبت کے مقدمات ہیں یا اس کے توابع و نتائج:

فان المحبة لله هى الغاية القصوى من المقامات والذروة العليا من الدرجات، فما بعد ادراك المحبة مقام الا وهو ثمرة من ثمارها وتابع من توابعها، كالشوق والانس والرضاء واخواتها ولا قبل المحبة مقام الا وهو مقدمة من مقدماتها، كالتوبة والصبر والزهد وغيرها (احياء العلوم ص ۲۹۴ من الجزء الرابع)

یعنی اللہ کی محبت تمام مقامات کی غایت قصویٰ اور تمام درجات کی سب سے بلند چوٹی ہے، اور ادراک محبت الٰہی کے بعد کوئی مقام ہی نہیں الا اس کے کہ اسی مقام محبت کے ثمرات کا ایک ثمرہ اور اس کے توابعات میں سے ایک تابع یا نتیجہ ہو، جیسے شوق، انس، رضا اور اس جیسے دوسرے مقامات اور نہ محبت سے قبل کوئی مقام ہے، الا اس کے کہ وہ اسی مقدمات میں سے ایک مقدمہ ہو، جیسے توبہ، صبر و زہد وغیرہ۔

اپنے اس دعوی کی تفصیل و تائید میں جو دلائل امام نے پیش کیے ہیں ان کو پڑھکر ہر ذی عقل کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ بات نفسیاتی طور پر صحیح کہی گئی ہے، مثلاً کسی نفسیات داں کو اس امر سے انکار نہیں ہوسکتا کہ خشیت یا خوف بھی محبت ہی کا ایک ضروری تابع یا نتیجہ ہے، گو بظاہر کم بیں کی نظر میں اس کی بالکل ضد کیوں نظر آئے، محب جو اپنے محبوب کو اپنی ذات سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہے، وہ اس چیز سے ڈرتا بھی ہے کہ کہیں اس سے ایسی حرکت سرزد نہ ہو جائے کہ اس کا محبوب اس سے ناراض یا خفا ہو جائے، اور یہی خشیت ہے، آپ محبت و خشیت کو دو علیحدہ علیحدہ صفات قرار دے سکتے ہیں، لیکن امام غزالی کا یہ کہنا صحیح ہے کہ فما بعد ادراك المحبة مقام الا وهو ثمرة من ثمارها وتابع من توابعها، تا

صوفی صاحب کا یہ خیال کہ محبت یا عشق کی وجہ سے باطن دین کی تکمیل کا نصب العین سرے سے مستور ہو کر محض باطنیت رہ گیا، سو اس کے متعلق عرض ہے کہ اگر اباحیۃ اور بے شرع صوفیہ نے ایسا کیا ہے اور صوفی صاحب کا روئے سخن ان ہی کی طرف ہے تو ان کی تنبیہ درست ہے، لیکن یہ تو صریح ظلم ہوگا کہ اکابر صوفیائے اسلام کے متعلق ایسا خیال کیا جائے جنھوں نے کبھی شرع کا دامن ایک آن کے لیے بھی نہیں چھوڑا، اور عبد و رب کے فرق کو ایک لحظہ کے لیے بھی نہیں ترک کیا۔

العبد عبد وان ترقى والرب رب وان تنزل

صوفی صاحب کے ایک مبغوض صوفی تک کا عقیدہ ہے!! کہ بڑے سے بڑے وجودی مرتبہ "فنا فی اللہ" میں بھی عبدیت کا نفس الامر میں منکر نہیں:

"از حصول مرتبہ فنا فی اللہ عبدیت از نفس الامر نمی رود بلکہ او (عبد) را لحاظ تعین خود

وصفات خود نمی باشد پس در نفس الامر عین حق نیست، و حجاب تعین گاہے مرفوع نمی شود از
نفس الامر، اگرچہ مرفوع می شود از شہود او، چنانکہ شیخ اکبر قدس سرہٗ در نصوص الحکم نص
آدمی) نقل فرمودند،، (جواہر غیبی ص ۸۹)

چنانچہ شیخ محب اللہ جو ایک کٹر وجودی صوفی ہیں، نص آدمی کی شرح میں کہتے ہیں:-

"پس ازیں جا ظاہر شد کہ تعین اصلاً مرتفع نمی شود از واقع، و عبد گاہے مطلق نمی شود و ممکن
واجب نمی شود، پس در فنا تعین از شہود می رود نہ غیر۔ و بعد نزول بقا علم و امتیاز میان
متعین پیدا آید، اما وجوب و اطلاق صفت ذاتیۂ حق ست عبد بآں موصوف نمی شود
و تقید و افتقار صفت ذاتیہ عبد است از وہ مرتفع نہ شود،،

اس سے ظاہر ہے کہ غیر اسلامی مسالک نے اگر عبد و رب کا فرق مٹا دیا ہے تو یہ ان کے مسلک کا
نقص ہے لیکن وجودیہ کے باوا آدم نے بھی مسلمانوں میں اس فرق کو بڑی سختی سے باقی رکھا ہے۔

بڑا تعجب تو یہ ہے کہ ہمارے صوفی صاحب اولیا کے سکر و بیخودی کو بھی باصنیت کا روگ سمجھتے ہیں (ص ۳۷)
وہ سکر، جذب و عشق کا قرآن حکیم میں کہیں ذکر نہیں پاتے (ص ۳۸) لہٰذا ان کیفیات کو دماغ کا خلل قرار دیتے ہیں (ص ۳۹)

ادھر سرتاج صوفیا امام ربانی حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانیؒ اسی سکر و جذب کے سلسلے میں اپنے
ایک مکتوب (مکتوب ۹۵ جلد ثالث) میں نہایت وضاحت اور صفائی کے ساتھ تحریر فرماتے ہیں:

ایں فقیر کہ ایں ہمہ دفاتر در بیان علوم و اسرار ایں طائفہ علیہ نوشتہ است ظاہراً ازیں جا خطر شما
قرار یافتہ است کہ از وے صحو محض نوشتہ است بے مزج سکر، حاشا و کلا کہ آں حرام و
منکرات دگزاف و سخن باقی است سخن باانسان کہ بصحو خالص متصف اند بیاد انداز اجرم
ایں قسم سخناں بیافند و ہمائے مردم را از جا برند ۵

زیاد حافظ ایں ہمہ آخر بہرزہ نیست　　ہم قصۂ غریب و حدیث عجیب ہست

تبصرہ نگار جیسا عامی مجدد صاحب کے اس مختصر مگر واضح بیان کو پڑھ کر سکر و جذب اولیا کے انکار
کی جرأت نہیں کر سکتا، زیادہ سے زیادہ وہ یہ کہہ سکتا ہے: "فربکم اعلم بمن ھو اھدیٰ سبیلا"!

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز نے اپنی مشہور و معروف کتاب اسماء الاسرار میں لکھا ہے کہ
سمجھ بوجھ کے لحاظ سے انسان تین درجے کے ہوتے ہیں۔ معمولی، متوسط اور اعلیٰ، یا عوام، خواص اور
اخص الخواص، مذہبی تعلیم میں بھی اس فرق کا لحاظ رکھا گیا ہے ــ کلموا الناس علی قدر عقولھم ـ
مذہب کی اساسی تعلیم توحید ہے، انبیاء علیہم السلام نے توحید کی تعلیم میں بھی لوگوں کی سمجھ بوجھ کا لحاظ
رکھا ہے، عوام کی توحید بت پرستی اور ہوا پرستی سے بچنا ہے، خواص پر لازم ہے کہ "خود پرستی"
سے بھی پرہیز کریں، اور اخص خواص کا مقام یہ ہے کہ اپنے وجود سے بھی دست بردار ہو جائیں۔

تا کہ با ماست جاں ما بہ وجود
یار از ما نمی شود خوشنود

اس لحاظ سے ہمارے مصنف علام کے "تذکیر الاحسان" کے مخاطب عوام و خواص ہیں اور اخص خواص
طبقہ کا وجود معدوم ہے۔

"جہاد اعظم کی تیاری" کے تیسرے حصہ پر ہمارے ان ریمارک سے قطع نظر مصنف علام کا یہ رسالہ
اپنے موضوع پر ایک نہایت کامیاب رسالہ ہے، اور آثار تائید الٰہی واللہ یؤید بنصرہ من یشاء
اس کے صفحات سے واضح ہیں، اور انوار توفیقات وما توفیقی الا باللہ اس کی عبارت سے لائح ہیں،
کاش موجودہ زمانہ کے مسلمان اس کی طرف توجہ کریں، اور اپنی حالت کو درست کریں، صوفی صاحب
کا لطف و کرم تو ہمیشہ میرے حال پر رہا ہے، لیکن اس رسالہ کو پڑھ کر میری زبان سے نکلا:-

اے سلت الی نسخۃ کاملۃ
تحوی حکمۃ جامعۃ شاملۃ

مطبوعات جدیدہ

قرآن اور آسمانی پروازیں۔ مرتبہ معین الدین رہبر فاروقی صاحب تقطیع خورد
کاغذ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۲۱۶، مع گردپوش قیمت ۳ روپے پتہ: منیجر مخزن
ہندوستانی ادویہ، نیاپل، قریب اسٹیٹ ٹاکیز، حیدرآباد دکن۔

مصنف نے اس کتاب میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کتاب وسنت میں جو پیشین گوئیاں اور غیب کی خبریں پائی جاتی ہیں یا قرآن نے جو باتیں کائنات اور انسان کی حقیقت وماہیت کے متعلق بیان کی ہیں، وہ علم وحکمت کے عین مطابق ہیں، اور موجودہ دور کی تمام سائنسی ترقیاں اور انسانی بلند پروازیاں ان اسلامی حقائق کی تصدیق کرتی ہیں، سائنس کے نظریات اور جدید انکشافات قرآن کی تعلیمات کے منافی نہیں، بلکہ ان سے مزید بصیرت اور ایمان میں پختگی پیدا ہوتی ہے، اس سے پہلے بھی اس موضوع پر بعض علماء نے رسالے اور کتابیں لکھی ہیں، مگر روز بروز نئے انکشافات ہورہے ہیں، اور خاص طور پر مصنوعی سیارہ اور انسان کے چاند پر پہنچنے کی کوشش نے بعض مزید نئے مسائل پیدا کردیے ہیں، ان سب مسائل پر مصنف نے بحث کی ہے، البتہ ان کا طرز بیان ذرا الجھا ہوا ہے، اس لیے مسائل کے ذہن نشین ہونے میں عام لوگوں کو دقت ہوگی۔

گنجینۂ گوہر۔ از جناب شاہد احمد صاحب دہلوی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت
وطباعت عمدہ، صفحات ۲۷۲، مجلد، قیمت ۶ روپے ناشر مکتبہ نیا دور، کراچی

اشخاص کی خاکہ نگاری ایک مستقل فن ہے، اور اردو میں اشخاص کے خاکوں پر بعض دلچسپ کتابیں

موجود ہیں، مذکورہ بالا کتاب بھی اسی نوعیت کی ہے، اس میں اردو کے مشہور اہل قلم شاہد احمد صاحب دہلوی نے مختلف طبقوں کی سترہ ممتاز شخصیتوں کے قلمی خاکے تحریر کیے ہیں، ان میں ڈپٹی نذیر احمد، میر ناصر علی، بیخود دہلوی، خواجہ حسن نظامی، مولوی بشیر الدین احمد دہلوی، مولوی عنایت اللہ صاحب دہلوی، مرزا عظیم بیگ چغتائی، جگر مرادآبادی اور جوش ملیح آبادی کے نام قابل ذکر ہیں، مصنف ایک کہنہ مشق ادیب وصاحبِ قلم ہیں، ان کی زبان دلی کی خالص ٹکسالی ہے، اس لیے ان شخصیتوں کی ایسی کامیاب مصوری کی گئی ہے کہ ان کی ساری خصوصیات نمایاں ہو جاتی ہیں، اور ہر شخصیت ایک جیتا جاگتا پیکر نظر آتی ہے، لطیف ظرافت کی چاشنی نے لطف تحریر کو اور دوبالا کر دیا ہے، اس لیے یہ کتاب ان شخصیتوں کا تذکرہ بھی ہے اور لطف زبان اور انشائے لطیف کا نمونہ بھی، اور ان دونوں حیثیتوں سے اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے۔

خیر کثیر۔ مترجمہ مولانا عابد الرحمٰن صدیقی کاندھلوی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت
قدرے بہتر، صفحات ۱۹۶ مجلد مع رنگین گردپوش، قیمت: ۵ روپے پتہ قرآن محل
مقابل مولوی مسافرخانہ، کراچی

حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تصوف اور علم اسرار حقائق سے متعلق مشہور وبلند پایہ عربی تصنیف کا اردو ترجمہ عربی متن کے ساتھ شائع کیا گیا ہے، اور شروع میں شاہ صاحب کے علمی ودینی کمالات پر بھی ایک اجمالی نگاہ ڈالی گئی ہے، اصل کتاب کی خصوصیات سے اہل علم واقف ہیں، ترجمہ بھی غنیمت ہے، لیکن توضیحی حاشیے بھی ہوتے تو یہ ترجمہ اردو خوانوں کے لیے اور زیادہ مفید ہوتا،

اقبال اور ان کا عہد۔ از جناب جگن ناتھ صاحب آزاد، تقطیع خورد
کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۲۶ مجلد مع گردپوش، قیمت: عہ

پتہ: ادارۂ انیس اردو، الٰہ آباد ۳

زیر نظر کتاب جناب جگن ناتھ صاحب آزاد کے تین مقالات شعر اقبال کا ہندوستانی پس منظر" "اقبال کے کلام کا متصوفانہ لب ولہجہ" اور "اقبال اور اس کا عہد" پر مشتمل ہے، یہ مقالے جموں و کشمیر یونیورسٹی کی دعوت پر لکھے گئے تھے، پہلے مقالہ میں اقبال کی اسلام سے غیر معمولی محبت کی بنا پر ان سے ہندوستان کی بے اعتنائی کو غلط قرار دیا گیا ہے، اور ان کو بھی تلسی داس اور ٹیگور کی طرح (جن کو ہندو دھرم سے عشق بے پایاں تھا) ہندوستان کے لیے باعث فخر بتایا گیا ہے، دوسرے میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اقبال کو اسلامی تصوف پر اعتراض نہ تھا، بلکہ وہ عجمی اور غیر اسلامی تصوف کے مخالف تھے، تیسرے مضمون میں اقبال کے فکر اور کلام پر ان کے عہد کے اثرات اور انکے عہد پر انکے فکر و کلام کے اثرات دکھائے گئے ہیں، لایق مصنف ایک باذوق، سخن سنج اور کلام اقبال کے عاشقوں میں ہیں، ان کو اسلامی قدروں سے بھی واقفیت ہے، اس لیے اس کتاب میں ان کے حسن ذوق اور نکتہ سنجی کے ساتھ یہ سب حیثیتیں بھی نمایاں ہیں، اور انھوں نے اقبال کی ترجمانی کا پورا حق ادا کیا ہے، اس کتاب سے اقبالیات میں ایک مفید کتاب کا اضافہ ہوا،

حیاۃ عبداللہ بن مسعودؓ (عربی) ۔ از جناب ڈاکٹر محمد احمد صاحب صدیقی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۴۸، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۴؍

پتہ: سراج الآفاق واخوانہ ۱۷۶، شاہ گنج، الٰہ آباد۔

ڈاکٹر محمد احمد صاحب صدیقی پروفیسر عربی و فارسی الٰہ آباد یونیورسٹی نے عربی زبان میں چھوٹے چھوٹے رسالے لکھنے کا جو مفید سلسلہ شروع کیا ہے، اس کی ایک کڑی یہ نیا رسالہ بھی ہے، لیکن ہندوستان کی بڑی شخصیتوں کو عربی ملکوں میں روشناس کرانے کے لیے تو ان کے حالات عربی میں لکھنا مفید اور کارآمد ہے، مگر صحابہ و تابعین اور اس عہد کی تمام دوسری عرب شخصیتوں

کے حالات تو خود عربی کی طبقات و تراجم کی کتابوں میں موجود ہیں، جن کی مدد سے اردو میں ان کے حالات لکھے جاتے ہیں، ایسی حالت میں ان کے حالات عربی میں لکھنے کی کوئی مصلحت سمجھ میں نہیں آتی، سوا اس کے کہ مصنف نے عربی میں ایک رسالہ لکھ دیا،

"ض"

رہبر حجاج ۔ از مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۶۲ قیمت ۱۲ر ناشر: ناظم مکتبہ اعظمی پٹھان ٹولہ مئو، ضلع اعظم گڈھ

حج کے موضوع پر بکثرت کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں یہ رسالہ امتیازی حیثیت رکھتا ہے، اس میں مولانا حبیب الرحمن صاحب نے حج کے مسائل بہت اچھے اور آسان انداز سے بیان کیے ہیں، حج و زیارت کے سلسلہ میں بعض غیر شرعی اور مروجہ رسموں پر بھی مولانا نے حرف گیری کی ہے اور اختصار کے باوجود بعض مسائل پر عالمانہ بحث بھی کی ہے، خاص طور پر عصر و مغرب کے بعد طواف کی دو دو رکعتوں پر بڑی مدلل بحث ہے، رسالہ ہر مسلمان خصوصاً عازمین حج کے مطالعہ کے لائق ہے، اور مختصر ہونے کی وجہ سے اس سے فائدہ اٹھانا آسان ہے،

"م - ج"

زمزمہ ۔ از جناب رشید کوثر فاروقی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت دیدہ زیب، صفحات ۱۶۰ مجلد، قیمت ۳؍ پتہ ادارۂ ادبیات عالیہ ۱۳۱ خیالی گنج، لکھنؤ۔

زمزمہ رشید کوثر صاحب فاروقی کے کلام کا مجموعہ ہے، نوجوان شعراء میں وہ خوشگو اور روشناس شاعر ہیں، ان میں شاعری کی صلاحیت کے ساتھ ذہانت اور علمی و فنی استعداد بھی ہے، اس لیے ان کا کلام آج کل کے نوجوانوں کی شعری و ادبی لغزشوں سے پاک اور زبان کی سلاست وصفائی، خیالات کی بلندی و رنگینی اور سوز و دردمندی وغیرہ تغزل کے تمام محاسن سے آراستہ ہے، امید ہے کہ مشق و ممارست کے ساتھ انکی خوبیاں اور نکھرتی جائینگی

کتاب کے شروع میں مصنف کے قلم سے ایک مبسوط مقدمہ اور اس کے ناشر افتخار علی صاحب علوی کاکوروی کے قلم سے ایک مختصر تعارف ہے، مقدمہ میں مصنف کے حالات اور ان کے کلام کے پس منظر کے ساتھ شعر و ادب کے متعلق بھی بعض مفید باتیں ملتی ہیں، مجموعی حیثیت سے زمزمہ اکم باسمی اور اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے۔

"م"

الرای السدید فی نصب المجھار لصلوٰۃ الجمعۃ والعید } از مولانا عبد القیوم صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۸، قیمت عہ پتہ محمد عبد الجمیل مہتمم دائرہ معارف اسلامیہ لطیفیہ، بالائے قلعہ علی گڈھ۔

نماز میں آلۂ مکبر الصوت کے استعمال کے بارہ میں علماء کا اختلاف جو خود سائنسدانوں کے اس اختلاف کا نتیجہ ہے کہ اس سے سنی جانے والی آواز متکلم کی اصلی آواز ہے یا نہیں، فاضل مؤلف کی تحقیق میں آلہ کی مدد سے اور بغیر آلہ کے دونوں صورتوں میں متکلم کی اصلی آواز نہیں سنائی دیتی، اس لیے ان کے نزدیک جب عام مقتدیوں تک امام کی آواز نہ پہنچنے کا اندیشہ ہو تو اس کا استعمال نہ صرف مباح بلکہ مستحب ہے، اس کے ثبوت میں انھوں نے جو دلائل لکھے ہیں وہ اصحاب افتاء کے لیے قابل غور ہیں، البتہ اس رسالہ کی قیمت زیادہ ہے۔

حکمت استخارہ - از جناب پروفیسر فضل احمد عارف ایم اے، چھوٹی تقطیع کاغذ معمولی، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۷۵، قیمت ۷۵ نئے پیسے، ناشر مکتبہ رشیدیہ باجیوں ضلع ملتان

اس رسالہ میں استخارہ کی حقیقت، اس کی اہمیت، شرعی حیثیت، شرطیں، مسنون طریقہ، تعداد، موافق یا غیر موافق ہونے کی علامتیں، اس میں اور فال میں فرق، کس معاملہ میں اسکو کرنا اور کس میں نہ کرنا چاہیے کے متعلق بڑی مناسب و مفید بحث کی گئی ہے، اور آخر میں استخارہ کے متعلق بعض بزرگوں کے طریقے بھی نقل کیے گئے ہیں۔

"ض"

جلد ۹۱، ماہ ذی الحجہ ۱۳۸۲ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۶۳ء، عدد ۵

مضامین